بیانِ اقبال

پروفیسر محمد منور

اقبال اکادمی پاکستان
۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ ○ لاہور

بُرہانِ اقبال

پروفیسر محمد منوّر

اقبال اکادمی پاکستان
۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ ○ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی

ڈائرکٹر اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ ، لاہور

طابع : میاں محمد سلیم صابر

مطبع : حبیب پریس ، ۱۶ - ایڈورڈ روڈ ، لاہور

طبع اول : نومبر ۱۹۸۲ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : ۲۲ روپے

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱-	مقدمہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان	XVI—I
۲-	قرآنی تصور تاریخ اور علامہ اقبال	۲۶-۱
۳-	علامہ اقبال ـــ مرد یقین	۶۶-۲۷
۴-	قرآن کی تعلیمی جہت اور علامہ اقبال	۹۲-۶۷
۵-	علامہ اقبال اور کتاب زندہ	۱۲۷-۹۳
۶-	علامہ اقبال بحضور قرآن	۱۵۰-۱۲۹
۷-	جہانِ اقبال ـ جہانِ قرآن	۱۷۸-۱۵۱
۸-	علامہ اقبال اور اجتہاد	۲۲۰-۱۷۹

بسمہ اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اقبال اور اقبالیات پر محترم پروفیسر محمد منور کے مقالات پیش نظر ہیں ۔ پروفیسر صاحب متعدد گرانمایہ علمی اور ادبی کتب کے مصنف ہونے کے علاوہ ملک کے مشہور اردو اور انگریزی روزناموں اور رسائل میں بصیرت افروز مقالات بھی لکھتے رہتے ہیں ، اقبالیات کا خصوصی مطالعہ انہوں نے اس لیے اختیار کیا کہ اس کے واسطے سے وہ نئی نژاد نور کو اسلام اور پاکستان سے محبت کرنے کا درس دے سکیں ، بحمد اللہ وہ اب اس مقام پر فائز ہیں کہ جہاں نہ صرف اقبالیات پر بلکہ مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر اُن کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہو ۔ اس مجموعہ مقالات ۔ برہانِ اقبال ۔ سے قبل وہ میزانِ اقبال ، ایقانِ اقبال ، علامہ اقبال کی فارسی غزل اردو میں اور Iqbal and Quarnic Wisdom انگریزی میں تصنیف فرما چکے اور داد پا چکے ہیں ۔ موجودہ مقالات کے مطالعے سے واضح ہو گا کہ محترم نے تمام ضروری ماخذوں سے استقصاء کیا ہے اور حتی الامکان کوئی اہم چیز فروگذاشت نہیں کی ۔ قرآن ، حدیث ، فقہ اور عربی ادب پر نظر رکھتے ہوئے مغربی علوم کو بھی دیکھا اور پرکھا ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ اُن کے موضوع کے لئے کون سے مصادر اور متابع ضروری ہیں اور کن سے اجتناب لازمی ہے ۔ اُن کی نظر نہ صرف وسیع ہے بلکہ حقیقت آشنا بھی ہے ، جس کی ایک ذمہ دار استاد ہی سے توقع کی جا سکتی ہے۔

پروفیسر صاحب کو اللہ پاک نے ''آہِ سحر،، اور ''نورِ بصیرت،، دونوں سے نوازا ہے ۔ اسی لیے وہ صحیح مسلمان فاضل کی طرح اقبالیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ حاصل

مطالعہ کو پیش کرتے ہیں ۔ اقبال کو قرآن سے شغف تھا ۔ وہ بغیر اس کے ایک قدم چلنا بھی گناہ سمجھتے تھے ، پروفیسر صاحب کو ان دونوں سے شغف ہے اور وہ ان دونوں کو مختلف سرخیوں کے تحت بار بار دیکھتے ہیں ، اُن پر لکھتے ہیں اور ان کی تبلیغ کرتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں اس مجموعۂ مقالات کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو اقبال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے ۔

علامہ اقبال نے یقیناً قرآنی روح کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ پروفیسر صاحب بھی اسی روح سے ایک مخلصانہ زندگی حاصل کرتے ہیں اور ان کی کاوش سے امید ہے کہ قارئین بھی روحِ تازہ حاصل کریں گے ۔ جس قوم کا خدا زندہ ہو ، جس کا رسول ؐ (حدیث) زندہ ہو اور جس کا قرآن زندہ ہو وہ قوم کس طرح مر سکتی ہے :

خدائے زندہ ، زندوں کا خدا ہے

پروفیسر صاحب بھی ایسی زندہ قوم اپنے طلبہ کے ذریعے تیار کر رہے ہیں اور ان کو موجودہ دور کے فتنوں سے بچانا چاہتے ہیں ۔ اللہ پاک ان کو تادیر سلامت باکرامت رکھے !

قرآنی تصورِ تاریخ اور علامہ اقبالؒ

اس مقالے میں محترم نے تاریخ کے لُغوی اور اصطلاحی معانی کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ مسلمان مورخّین نے کبھی تاریخ کو قصّہ کہانی یا دفع الوقتی کا ذریعہ نہیں بنایا ۔ بلکہ انہوں نے قرآن کے حکم کے مطابق (قل سیروا فی الارض ۔) ہمیشہ اُسے عبرت آموزی اور حوصلہ مندی کا سبق قرار دیا ہے ۔ قدیم الایام میں قوموں کی تباہی جو احکام الٰہی سے منہ موڑنے اور قانون قدرت سے جنگ کرنے کی وجہ سے ہوتی رہی ہے ، انسان کو بیدار کرنے اور زندگی کا سلیقہ سکھانے کے لیے کافی ہو سکتی ہے ۔ تاریخ یہی سکھاتی ہے

کہ حاکم و محکوم دونوں یہ جان لیں کہ حکومت صرف اللہ کی ہے جو ہر حال اور ہر زمانے میں جاری و ساری رہتی ہے اور اُس کے احکام کی خلاف ورزی ہر زمانے میں تباہی کی موجب ہے ۔ گویا تاریخ ہر شخص کو گہرے غور و فکر کی دعوت دیتی ہے ۔ وہ قوموں کے عروج و زوال ، اُن کے اخلاق و کردار اور عقل و دانش کی ایک ایسی کہانی ہے جو حقیقت تک پہنچا سکتی ہے اور اصلیت سے آگاہ کر دیتی ہے ۔ علامہ اقبال کے نزدیک (جیسا کہ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے) ابن خلدون جیسے مورخ کی تاریخی بصیرت کا سرچشمہ قرآن ہے ۔ جو بار بار تفکر و تدبر کی تعلیم دیتا ہے جس سے علم اور مشاهدے میں پختگی اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے اور وہ حقائق سامنے آ جاتے ہیں ، جو حیات انسانی کے لیے مشعلِ ہدایت ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی تصورِ تاریخ ہی انسان فہمی کا درس دیتا ہے ۔ اس سلسلے میں پروفیسر صاحب نے علامہ اقبال کا وہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اٹلی کے پرنس کیتانی نے اسلامی تاریخ کے لیے لاکھوں روپیہ صرف اس لیے صرف کیا تھا کہ ”اسلامی تاریخ ، عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے“ ۔ اسی لیے علامہؒ نے یہ مشورہ دیا ہے کہ ”اُمم انسانی کا مطالعہ ، اجسامِ نامیہ کے طور پر علمی نہج پر کرنا چاہیے“ ۔ کیونکہ تاریخ ، انسانی ترقی کی ایک مسلسل حرکت ہے جسے ماضی ، حال اور مستقبل کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ۔ انسان نے کیا کِیا اور وہ کیا کرتا ہے یا کر سکتا ہے سب تاریخ میں شامل ہے ۔ اس طرح انسان کے عمل اور بے عملی دونوں کی کہانی (بقول علامہ) ”فَذَكِّرْهُمْ بِاَیَّامِ اللہِ“ کی تعمیل میں سبق آموز بن جاتی ہے ۔ پروفیسر صاحب نے اس تفصیل کا اجمال اس طرح بیان فرمایا ہے کہ تاریخ کی حیثیت اہلِ نظر افراد کے لیے ایک لائحۂ عمل ، ایک

جولاں گاہِ امکان ، ایک تازیانۂ عبرت اور ایک جرأت آموز درس ہے تاکہ وہ ہر دم اپنے کردار اور اپنے رویے کا جائزہ لیتا رہے اور دم بدم دیکھتا رہے کہ وہ رو بہ ترقی ہے یا ٹھہراؤ کا شکار ہے ،،۔ علامہ اقبال نے اسی ''ایام اللہ ،، کے فلسفے کو ایک زندہ حقیقت قرار دے کر نظریۂ خودی کو استحکام بخشا ہے ، کیونکہ :

ایں ترا از خویشتن آگہ کند

علامہ اقبال ۔ مردِ یقیں

اس مقالے میں پروفیسر صاحب نے ایک صحیح مسلمان کی تعریف کے سلسلے میں یہ بحث کی ہے کہ جو شخص مردِ امتحان نہیں وہ صحیح معنی میں مردِ ایمان نہیں ۔ یعنی دین کو قبول کر لینا اور ہے اور دین میں پختہ ہو کر اس پر عمل راسخ کرنا اور بات ہے ۔ علامہ اقبال نے اسی ایمان کی تبلیغ کی ہے جو مشکلات کا مقابلہ کرنا سکھائے ،، جو غیر اللہ کو کوئی طاقت نہ سمجھے اور جو اللہ کے حکم پر بے خطر ہو کر '' آتش نمرود ،، میں کود پڑنے کا حوصلہ بخشے ۔ پروفیسر صاحب نے تاریخی ترتیب کے مطابق علامہ اقبال کے کلام سے اس نظریے کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ علامہ کو ایسے مردِ یقین کے بہتر سے بہتر مستقبل پر یقین تھا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اس بات کو مان نہیں سکتے تھے کہ اسلام اور مسلمان کبھی مغلوب ہو سکتا ہے ۔ اللہ پاک کی ذات پر کامل یقین اور صرف اس کا رشتہ ہی پائدار رجائیت کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے ۔ اسی لیے وہ کہتے تھے کہ :

یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

حالات مایوس کن بھی ہوں ، زوال انتہا کو بھی پہنچ چکا ہو اور طاغوتی طاقتیں کتنی ہی سرکش ہوں ، مسلمان کو تباہ نہیں کر سکتیں ۔ ایسے مسلمان کا یقین ہی سرمایۂ قوت ہے ۔

یقیں ، افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیرِ ملت ہے

یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر عالمِ اسلام کی سیاسی مغلوبیت ، اہلِ بصیرت کے نزدیک محض عارضی تھی اور وہ جلد ختم ہونے والی تھی ۔ بلکہ :

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

مغربی استعمار کو مادی قوت حاصل تھی اور نئی سائنسی ایجادات نے آدم کشی کے لیے بہت سے وسائل پیدا کر دیے تھے لیکن علامہ کو یقین تھا کہ :

مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ

مغرب سے مرعوب ہو کر اس کی ''غیر عفیف،، مدنیت کو اختیار کرنا اور ''خوب ،، کو چھوڑ کر '' نا خوب ،، کی طرف دوڑنا ایک مردِ یقین کا مسلک نہیں ہو سکتا ۔ اس کے بدن میں اگر ''سوزِ لا الٰہ،، ہو تو ''علومِ تازہ کی سرمستیاں،، اسے گمراہ نہیں کر سکتیں اور ''یقین،، کی بدولت وہ خود کو غالب کرنے کا عمل سیکھ سکتا ہے :

عمل خواہی ؟ یقین را پختہ تر کن
یکے جوی و یکے بین و یکے باش

اور نقطۂ پرکارِ حق ، مردِ خدا کا یقین

آخر میں پروفیسر صاحب نے علامہ کے اس نظریے کی تفصیل پیش کی ہے کہ :

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُر کار و فسوں ساز ہے ، نم ناک نہیں ہے

اور لکھا ہے کہ علامہ کی مومنانہ بصیرت اس نُور کی روشنی میں کار فرما تھی جو اللہ نے انہیں ان کے خلوصِ خاطر کے باعث عطا کر رکھی تھی ۔ وہ موتیوں اور جھوٹے نگوں میں تمیز کرنا جانتے تھے

اور مادی قوت اور مادی لذت کے انجام سے واقف تھے ،، اور یہ مومنانہ بصیرت صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں حاصل ہوئی تھی کہ :

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

قرآن کریم کی تعلیمی جہت اور علامہ اقبال

پروفیسر صاحب نے بڑی فاضلانہ تمہید کے ساتھ اس مقالے کا آغاز کیا ہے کہ قرآن کو جو اللہ کے نام سے پڑھنے کا حکم ہوا ہے وہ اس لیے ہے کہ وہ اسرارِ الٰہی کا خزینہ اور قدیم و جدید علوم کا امانت خانہ ہے اور یہیں سے قرآنی تعلیم کی جہت طے ہو جاتی ہے ۔ اور اللہ کے نام سے آغاز کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مطلق خلاقی کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے جب اشیاء کا مطالعہ کیا جائے گا تو پوری کائنات ایک با معنی وحدت نظر آئے گی اور اس کے تمام ذرے ایک دوسرے سے مربوط نظر آئیں گے ۔ اس لیے :

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اگر ہم اس کی مطلق خلاقی کا آج اقرار نہ کریں تو مجبوراً یہ اقرار کل کرنا پڑے گا ، کیونکہ اشیاء کی حقیقت صرف وہ ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے بتا دی گئی تھی ۔ مثلاً (جیسا کہ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے) اشیاء ، دخان (دُھنواں) اور گیس سے شروع ہوئیں ۔ ہر ذی حس شے ہمہ نوع پانی سے پیدا ہوئی ، ہر ذی حس کے جوڑے پیدا کیے گئے ، تمام سیارے اپنے اپنے مدار پر گردش کرتے ہیں ، اس دنیا کی طرح اور بھی دنیائیں ہیں ، وغیرہ ، یہ ایسے حقائق ہیں کہ جن کا آج اعتراف کرنا گویا قرآن کی حقانیت کا اعتراف ہے ، یا دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی مطلق خلاقی کا اعتراف ہے ، اور سائنس جس قدر ترقی کرے گی اسی اعتراف کو مستحکم بناتی رہے گی ۔

کائنات ، تاریخ اور نفسِ انسانی کا مطالعہ ہی (علامہ اقبال کے نزدیک) انسانی حیات اعلٰی علّیین کا نظریہ عطا کرتا ہے اور یہی ''سَخّر لَکُم مَا فِی السمٰوٰتِ وَمَا فِی الاَرْض'' کا تقاضا ہے۔ جب انسان اس انداز سے سوچتا ہے اور نباتی ، حیوانی اور جبلی سطح سے آگے بڑھ کر نیابت خداوندی کے حصول کی کوشش کرتا ہے اور یہی سفر نامۂ خودی بھی ہے ، تو وہ صحیح زندگی کو پا سکتا ہے لیکن اس کے لیے شرط صرف یہ ہے وہ ایک خدا پر پختہ ایمان رکھتا ہے ، کیونکہ یہی ایمان اس کو خودی کی اقدار سکھاتا ہے۔ یعنی:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

غیر اللہ کا انکار ، انسان کو شخصی وحدت کا تصور دیتا ہے اور اس کے اندر ایسے عزائم پیدا کر دیتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے اندر تک چیزوں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔ خدا کی طرف بڑھنا خود آگہی کی ضمانت ہے اور ''بندۂ خدا مست'' ہی مسلسل جدو جہد اور پیہم جستجو کو اپنا کر اپنی خفتہ صلاحیتوں کا صحیح فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

آخر میں پروفیسر صاحب نے علامہ اقبال کے نظریۂ ایمان و ایقان کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ''قرآن تمام کتب سماوی کی روح کی نمائندگی کرتا ہے اور تکمیل بھی ، اسی طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں آپؐ سے پہلے آنے والے جملہ پیغمبروں کی سیرت تکمیل یاب ہوئی''۔ یہی سیرت اللہ پاک سے اور اس کی لا محدود نعمتوں سے قریب کر دیتی ہے اور یہی اصل تعلیمی جہت ہے۔

علامہ اقبال اور ''کتابِ زندہ''

اس مقالے میں پرفیسر صاحب نے قرآن پاک کے ظاہری اور

باطنی محاسن کے متعلق گوئٹے اور فلپ حتی کے اقوال درج کر کے اس ''کتاب زندہ،، کی زندگی آموز اور انقلاب آفریں حیثیت کا ذکر کیا ہے کہ قرآن اللہ پاک کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے ، محکوم کو حاکم بننے کی دعوت دیتا ہے ، فطرت (قدرت) کے گہرے مطالعے کے لیے آمادہ کرتا ہے اور انسان کو اس مقام پر پہنچانا چاہتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے ، علامہ اقبال نے جس انداز سے اس کتاب کے فضائل بیان کئے ہیں وہ بھی دیکھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتے ہیں کہ :

''انسان (باعتبار اپنی کُنہہ کے) ایک تخلیقی فعالیت ہے ، ایک صعودی روح جو اپنے عروج اور ارتقاء میں ایک مرتبۂ وجود سے دوسرے میں قدم رکھتا ہے ،، ۔ یعنی اللہ پاک نے مختلف چیزوں کی قسم کھا کر (سورہ الانشقاق ١٦ تا ١٩) فرمایا ہے کہ تمھارا ارتقاء اور سفر حیات و رفعت جاری رہے گا ۔ یہ کائنات محض تکرار نہیں ۔ بڑھتی ہوئی اور ہر لحظہ ترقی پذیر کائنات ہے ، یہاں رُکاؤ نہیں اور بالخصوص انسان وہ شئے نہیں جسے ایک ہی حالت میں رہنا ہو ۔ گویا قرآن حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ ایک دَور کے بعد دوسرا دَور آئے گا جس کو تسخیر کے لیے انسان کو ہر وقت کوشاں رہنا چاہیے :

صد جہان تازہ در آیات اوست
عصر ہا پیچیدہ در آنات اوست

قوموں کے زوال کا سبب خود ان کی غفلت ہے۔ فکر و عمل کی دیانت نہیں تو قدرت و قوت میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور حصول نعمت کے لیے جو صلاحیت اور قابلیت ودیعت کی گئی ہے اس سے کام نہ لیا جائے تو زوال یقینی ہے اور اجتماعی غلط کاریوں کی وجہ سے سزا بھی لازمی امر ہے ، قرآن اسی صلاحیت کو اُبھارتا ہے کیونکہ وہ رحمت بھی ہے ، برکت بھی ، نور بھی ہے اور شفا بھی

ہے - اسی سے تقویٰ اور نیکی پیدا ہوتی ہے ، برائی قریب بھی نہیں آ سکتی - زندگی کا " حیوانی پہلو " دور ہو جاتا ہے اور مادیت سے رشتہ ختم ہو جاتا ہے ، یا بہت کم ہو جاتا ہے - پھر ایسی قوم پیدا ہوتی ہے جس میں ہم رنگی اور یک جہتی لازمی ہے:

مدعاے ما ، مآل ما یکسیت طرز و انداز و خیال ما یکسیت

اور یہی قوم "خیر اُمہ" کہلائی جاتی ہے ، جو سکوت و جمود سے بھاگتی ہے اور تخلیقی فعالیت سے لطف اندوز ہوتی ہے ، ایسی قوم ، قانون کی پابند ہوتی ہے اور معاشرے کے لیے اُس کا وجود ایک نعمت غیر مترقبہ بن جاتا ہے :

قدرت کے مقاصد کا عیار اُس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان ، قیامت میں بھی میزان

انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے اس لیے مادیت سے اُس کا رشتہ ہے - لیکن اگر مادیت اور ارضیت سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے تو وہ غیر ذی حیات بن جاتا ہے اور ما سوا اللہ کی محبت سے محکوم ہو کر وہ روحِ اسلام اور روحِ قرآن سے محروم ہو جاتا ہے - جب افراد ایسے ہو جاتے ہیں تو قوم اپنے قرآنی اعزاز (خیر اُمہ) کو کھو بیٹھتی ہے - پروفیسر صاحب نے علامہ اقبال اور قرآن پاک کے حوالوں سے بتایا ہے کہ وہ انسان باقی ہے اور ایسی قوم زندہ رہتی ہے جو قرآنی اخلاق پر قائم رہتی ہے ، یعنی اُس کے دل میں صرف خدا بس رہا ہو - وہ خود آگاہ ہو اور غیر اللہ کی مُنکر ہو ، ورنہ حساب کا دن جب آئے گا تو اُس کی ذمہداریوں کے متعلق بھی سوال ہوگا اور اُس کی "بے یقینی" کا بھی محاسبہ ہوگا - لیکن " یقین " وہ عطیۂ خداوندی ہے جس کی بدولت ہر وقت اور ہر دم دنیوی زندگی کا احتساب ہوتا رہتا ہے اور جب انسان کی زندگی دوسری دنیا میں بھی ہو گی تو وہاں " یقین " ہی کار آمد ہو سکے گا - بقول علامہ :

جاے کہ بخشند دیگر نگرید آدم بمیرد از بے یقینی

علامہ اقبال ۔ بحضور قرآن

رموزِ بیخودی کے آخر میں (جب کہ علامہ کی عمر قریب ۳۸ سال تھی) علامہ اقبال نے ایسے پُر درد اور پُر کیف اشعار شامل کیے ہیں کہ اُن کا جواب پوری فارسی شاعری میں شاید ہی کہیں ہوگا ۔ یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض ہے کہ :

گردلم آئینۂ بے جوہر است گر بحرفم غیر قرآں مضمر است
خشک گرداں بادہ در انگور من زہر ریز اندر مئے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

قرآن اور حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و شیفتگی علامہ اقبال کو اُن کے والدین کی تربیت کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی ۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

"جب میں ایف ۔ اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا ۔ والد صاحب مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا اور کبھی جاری رہتی۔ ایک دن آ کر پوچھتے ہیں : "کیا پڑھتے تھے"؟ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آ گیا کہ چھ مہینے ہو گئے اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہوں ، پھر یہ سوال کیسا ؟ نہایت نرمی سے فرمایا ، "میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ میں بھی آ جاتا ہے"؟ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا ۔ میں نے کہا ، کچھ عربی جانتا ہوں ، کہیں کہیں سمجھ میں آ جاتا ہے ۔ بات ختم ہو گئی۔ کوئی چھ ماہ بعد انہوں نے ایک دن فرمایا ، بیٹا ! قرانِ کریم اُس کی سمجھ میں آ سکتا ہے ، جس پر یہ نازل ہوتا ہے ۔ میں حیران تھا کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی کی سمجھ میں آیا ہی نہیں ۔ فرمایا یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآنِ کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا ۔ میں پھر حیران ہوا تو فرمایا ، انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے اُس کا نمونہ ہمارے سامنے

محمدؐ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے ۔ حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک ہر نبی ، محمدؐ ھی کے مختلف مدارج تھے ۔ وہ سلسلے گویا Muhammad in the Making (تکمیل محمدؐ) کے منازل تھے ۔ بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا ۔ البتہ شعورِ انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی ۔ حتیٰ کہ محمدؐ مکمل ہو گیا ۔ بابِ نبوت بند ہو گیا اور انسانیت اپنی معراج کبریٰ تک پہنچ گئی ۔ اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونۂ محمدؐ موجود ہے ۔ کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآن اس پر نازل ہوتا جاتا ہے ۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا ، کہ قرآنِ کریم اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے ، جس پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے ،، (رسالہ فکرو نظر ، اسلام آباد ، اگست ۱۹۷۶ء) ۔

پروفیسر صاحب نے اس شیفتگی کے دوسرے واقعات بھی لکھے ہیں کہ علامہ اقبال (لفظاً اور معنیً) قرآن کو کلیۃً اللہ پاک کا کلام سمجھتے تھے جس کی توجیہہ کے لیے ڈاکٹر لوکس والا واقعہ بھی درج کیا ہے اور یہ کہ اسی کتاب نے لوگوں کی زندگیاں بدل دی ہیں : دگر گوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

یہ کتاب نور بھی ہے ، شفا بھی ہے اور رحمت و برکت بھی ۔ ایسی ہے کہ جس کی کوئی مثال نہیں اور ایسی ہے کہ انسان کی زبان اس کی تمام خوبیاں بیان کرنے سے قاصر ہے ۔ وحدت آدم کا رشتہ بھی یہی کتاب استوار کرتی ہے ، دلوں پر اب بھی نازل ہوتی رہتی ہے ۔ یقین کا درس دیتی ہے اور اس کا پڑھنے والا اور اس پر عمل کرنے والا خود قرآن بن جاتا ہے کہ :

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے ، حقیقت میں ہے قرآں

قرآن کوئی تلخ دوا نہیں ۔ وہ ایک لذیذ اور زندگی بخش غذا ہے لیکن انہی کے لیے جو اس پر یقین رکھتے ہیں ۔ علامہ فرماتے ہیں :

گر ہمی خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

پروفیسر صاحب نے اس مقالے میں یہی نکات بالتفصیل بیان کیے ہیں ۔

جہانِ اقبال ۔ جہانِ قرآن

اس مقالے میں پروفیسر صاحب نے علامہ اقبال کے نظریے پر بحث کی ہے کہ قرآن کس طرح قدیم ہے اور اس کی حکمت کیونکر لا زوال ہے ۔ وہ قیامت تک کسی رنگ و نسل ، وطن اور زبان کی تمیز کے بغیر سب کے لیے رحمت و نعمت ہے اور ایسی با برکت کہ اس پر عمل کرنے والا ہمیشہ فتح یاب ہے اور یہ کہ :

مذہب او قاطع مُلک و نسب

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت (جیسا کہ علامہ کا نظریہ ہے) علاقائی اور ارضی رشتوں کو ختم کرتی ہے ، کیونکہ یہ رشتے محدود ہیں اور دین محدود نہیں :

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است

اور ہر وطن ، اسلام کا وطن ہے ۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اپنا وطن اور اپنا مسقط الراس زیادہ پسند ہوتا تو فتح مکہ کے بعد مکہ ہی میں قیام فرما ہوتے ۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ : ''اللہ تعالیٰ کو پردیسی سب سے زیادہ عزیز ہیں'' ۔ پوچھا گیا ، کون سے پردیسی ؟ فرمایا ۔ '' وہ جو دین کو بچانے کے لیے بھاگتے پھرتے ہیں ۔ وہ قیامت کے دن عیسیٰ بن مریم کے درجے پر ہوں گے'' ۔

حضرت سلمان فارسی رض '' ابنِ اسلام '' تھے اور ''ابن آدم'' تھے ۔ اس لیے نسل اور وطن کے ہر رشتہ و پیوند سے آزاد تھے ۔ صحابہ کرام اپنے خاص الخاص عزیزوں سے بھی اسلام کی خاطر جنگ کرنا فرض سمجھتے تھے ۔ گویا ہم کو دین ہی کے رشتے پر قائم رہنا ہے اور قرآن کے ارشاد کے مطابق ''بے شک جو تم میں سب سے زیادہ صاحب تقویٰ ہوگا وہی اللہ کے نزدیک سب

سے زیادہ معزز ہوگا ،، اسی لیے علاّمہ کے نزدیک ''ہر صحیح مومن ، فوق البشر ہے اور اسلام وہ بہترین سانچا ہے جس میں فوق البشر ہی ڈھلتے ہیں،، ۔ اسلام ہی وہ رحمت و نعمت ہے جو انسان کے مزاج سے ''حیوانیت،، کو دور کرتا ہے اور روحانیت کو قریب کر دیتا ہے :

جز بقرآن ضیغمی ، روباہی است فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

لیکن آج کا مومن ایسا نہیں ہے ۔ چنانچہ ابلیس کے طنز کو علاّمہ اقبال اس طرح پیش کرتے ہیں :

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری ، بندۂ مومن کا دیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے لیکن ہے یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

پھر پروفیسر صاحب نے علامہ کے اُن خیالات کا ذکر بھی کیا ہے جو فلسفۂ یونان سے متعلق ہیں اور یہ کہ '' یونانی فلسفے نے مفکرینِ اسلام کے مطمحِ نظر میں اگرچہ کچھ وسعت پیدا کر دی تھی لیکن بحیثیت مجموعی ، قرآن مجید میں اُن کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی،،۔ حالانکہ قرآن ، اَزہان کو ایک ذمہ دار فرد اور خود مختار وجود قرار دیتا ہے جہاں بصیرت ہی کو فروغ ہو اور جس کی خودی ، خودنگر و خودگر و خودگیر ہے اور یہی انسانی فضیلت اور افضلیت بھی ہے ۔ علامہ اس طرح بھی فرماتے ہیں :

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شُستم
اسرارِ جہاں دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

حقیقۃً یہ ہے کہ قرآن ہی انسان کو ہمہ جہتی تربیت بخشتا ہے اور مادی ترقیوں کے ساتھ ساتھ روحانی تسکین اور اطمینان بھی عطا کرتا ہے ۔ یہی وہ کتاب جو غیر متوازن اور غیر متناسب قوانین

کو مسترد کرتی ہے اور حیوانیت کی جگہ روحانیت اور للّٰہیت کی تعلیم دیتی ہے۔ یہی جہانِ قرآن ہے اور یہی جہانِ اقبال بھی۔

علامہ اقبال اور اجتہاد

انبیاء علیہم السلام سب کے سب ایک ہی دین کی تبلیغ فرماتے رہے۔ اُن کی سیرتوں کی تکمیل سیرۃ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں ہوئی اور اُن سب کے دین کی تتمیم دینِ محمدی ؐ سے ہوئی۔ اب یہی دین قیامت تک ضابطۂ حیات بنا رہے گا اور اس ضابطۂ حیات کا مصدر قرآن ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃِ طیبہ صرف قرآن کے آئینے میں دیکھی جا سکتی ہے جو ہمیشہ کے لیے بے داغ اور ہمیشہ کے لیے بے مثال ہے۔

اس مقالے میں پروفیسر صاحب نے اسی موضوع پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ جو اجتہاد فقہ کا عملی ارتقاء ہے وہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃِ طیبہ ہی کی روشنی میں پہچانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ زندگی کے ہر شعبے کو اسی سیرۃ طیبہ کے مطابق ڈھالنا اسلام کی معاشرتی یک جہتی ہے اور ہمارے اسلاف کرام نے اسی معاشرے کو اپنایا تھا۔ علامہ اقبال کی دلی تمنا تھی کہ وہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کو قرآن اور سیرۃ طیبہ کی روشنی میں دیکھیں اور اسلامی اصولِ فقہ پر ایک کتاب لکھیں۔ وہ فرماتے تھے کہ ”میرا مقصود یہ ہے کہ زمانۂ حال کے (Jurisprudence) کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے۔ مگر غلامانہ انداز میں نہیں، بلکہ ناقدانہ انداز میں، یعنی وہ چاہتے تھے کہ دورِ جدید کے تمام عمرانی علوم کی روشنی میں اسلام کے اجتماعی (عمرانی) اصول و احکام کی توضیح و تشریح کی جائے اور اسلام کے اساسی اصولوں کی غیر متبدل روح کو پیش نظر رکھ کر ہر زمانے میں اُبھرنے والے سوالوں کا جواب دیا جائے۔ فقہ اسلامی میں اسی کوشش کو اجتہاد کہا جاتا ہے جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے

کے لیے کی جاتی ہے۔ حضرت معاذ ابن جبل نے اسی سلسلے میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ اگر کسی امر کے فیصلہ کرنے کے ضمن میں آنہیں قرآن اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی میسر نہ آئے گی تو وہ خود اپنی رائے سے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی یہ بات پسند فرمائی تھی۔ آخر کار ہمارے فقہاء نے فتوحاتِ اسلامی کے ساتھ ساتھ جو نئے نئے مسائل درپیش آئے، اُن کے لیے مستقل ضابطے اور قاعدے مرتب کیے اور یہیں سے فقہ کے مستقل مذاہب وجود پذیر ہوئے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے مختلف ادوار کے اجتہادی کارناموں کا ذکر کر کے اس امر پر بھی بحث بھی کی ہے کہ حقِ اجتہاد کس کو حاصل ہے اور یہ کہ علامہ اقبال اس اجتہاد کے لیے منتخب شدہ مجلس (ماہرین) کو درست سمجھتے تھے، لیکن وہ آزاد خیالی کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ ماضی کے بندھن سے ہٹ کر آزاد خیالی بالعموم تفرقے اور انتشار پیدا کرتی ہے۔ حضرت علامہ نے اسی لیے قرآن کو اسلامی قانون کا اولیں ماخذ قرار دیا ہے جس سے قانونی ضابطے مستنبط ہو سکتے ہیں۔ پھر اس قانون کے لیے دوسرا ماخذ حدیث ہے جس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ:

''احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ قرآنی کی تعبیر فرمائی، تو اس سے اُن قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہو گی جو قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کیے ہیں''۔ علامہ نے مجالس تشریعی کے توسط سے پیدا ہونے والے اجماع کو بہت سراہا ہے کہ اس طرح مختلف مسلکوں کے اہلِ نظر علماء آپس

میں قریب سے قریب تر ہو جائیں گے - پھر مختلف مسلم ممالک کی آزادی کے بعد اجماع (جو اجتماع آرا کا نام ہے اور جو قرآن یا حدیث کی روح سے زندہ ہوتا ہے) اور اُس کا میدانِ عمل وسیع ہو جاتا ہے اور قیاس (جو اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے) بہت مفید کام انجام دے سکتا ہے - پروفیسر صاحب نے بہت تفصیل سے علامہ کے ان افکار کا جائزہ لیا ہے اور ان کی اہمیت کو پوری طرح واضح کیا ہے -

یہ مقالات کیا ہیں اور کیسے ہیں قارئین خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں- راقم الحروف تو صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ :

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

(ڈاکٹر) غلام مصطفیٰ خاں
ایم - اے ، ایل ایل - بی ، پی ایچ - ڈی
ڈی - لٹ
حیدر آباد (سندھ)

قرآنی تصور تاریخ اور علامہ اقبال

تاریخ کا لغوی معنی ہے تحریر کرنا ، قلمبند کرنا ، رجسٹر میں اندراج کرنا ، مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ فلاں دن کا لکھا ہوا ، تو کہتے ہیں مورخہ اتنے ، مہینہ فلاں ، سال فلاں - ایک عرب مورخ کے مرنے پر کسی شاعر نے کہا تھا :

و کان یورخ ذکر الانام !! وھا ھو ذا الیوم قد اُرّخا

(وہ دوسروں کے احوال قلمبند کیا کرتا تھا - لو دیکھو آج وہ خود بھی قلمبند ہو گیا ، درج کر لیا گیا)

انگریزی میں Part of History ہو جانا کہتے ہیں اس کیفیت کو اردو میں قصہ ماضی ہو جانا قرار دیا جاتا ہے :

میرے اسلام کو اب قصہ ماضی سمجھو !

گویا تاریخ کا مفہوم اصطلاحاً ، عام طور پر ، عہد گذشتہ کی وہ داستان ہے جس کا تعلق انسان سے ہے - مسٹر ٹائن بی یہاں بھی خصوصی تحدید سے کام لیتے ہیں ، وہ کہتے ہیں کہ تاریخ کا نقطۂ آغاز وہ دور ہے جب انسان نے ایک مہذب معاشرے کے فرد کی حیثیت اختیار کی -

("What we call history is the history of man in a civilized society") 1:

مسٹر ٹائن بی کا خیال ہے کہ اگر تاریخ سے مراد وہ سارا عرصہ ہو جو نوع انسان نے اس خاکدان میں بسر کیا تو پھر دور تہذیب اس کل کا بمشکل دو فیصد بنے گا۔ اس اعتبار سے آغاز تاریخ کو ایک مخصوص علم کی حیثیت سے آغاز تہذیب کے ساتھ

1. A study of history (Abridged Edition, Vol : I) USA 1971. P. 61.

وابستہ کرنا کوئی زیادتی نہیں - دور قبل از تاریخ کے ضمن میں جو کچھ معلومات فراہم ہوں انہیں "علم الانسان" یا "انسانیات" (Anthropology) کے شعبے کا حق سمجھا جانا چاہیے -

علم تاریخ اگر داستان ماضی ہی ہے تو کیا اس کا مصرف صرف وہی ہے جو قصے کہانی کا ہوتا ہے ؟ یعنی محض دل بہلاوا اور دفع الوقت کا سامان ؟ — نہیں ایسی بات نہیں ، کم از کم مسلمان مورخین میں سے کسی نے بھی اسے قصہ کہانی قرار نہیں دیا ، ہر مسلمان مورخ تاریخ کے محتویات کو زندہ حقائق قرار دیتا ہے اور زندہ افراد کو دعوت دیتا ہے کہ کان کھول کر یہ داستان سنے اور آنکھیں کھول کر مناظر ماضی کا مشاہدہ کرے ، اس طرح اسے عبرت بھی حاصل ہوگی ، اس کا حوصلہ بھی بڑھے گا اور وہ ایک بہتر انسان بننے کی کوشش کرتا رہے گا -

اس میں شک کی گنجائش کم ہی ہے کہ مسلمان مورخین کا نقطۂ نظر بڑی حد تک قرآن کریم سے متاثر ہے ، قرآن کریم نے بار بار تلقین کی ہے کہ دنیا میں گھومو پھرو ، اور پھر دیکھو کہ وہ لوگ جو تم سے قبل ہو گذرے ہیں کس انجام کو پہنچے ، ان میں وہ بھی تھے جو تم سے زیادہ قوت و سطوت والے تھے — ان قدیم اقوام میں سے بعض اس لئے برباد ہوئے کہ انہوں نے آئین خداوندی سے منہ موڑ کر دنیا کی فانی عشرتوں ہی کو سب کچھ جان لیا تھا - وہ مغرور بھی ہو گئے تھے اور غافل بھی - انہوں نے انجام کی طرف سے آنکھیں یکسر بند کر لی تھیں ، یہ بے اعتدالی انہیں لے ڈوبی - بعض اس لئے برباد ہوئے کہ انہیں حرص و آز اور دیگر گونا گوں حیوانی ہوس کی بے لگامی نے جبلتوں کے قیدی حیوانوں ہی کی سطح پر لا رکھا ، بعض اس لئے برباد ہوئے کہ انہوں نے خدا کا انکار کیا اور آئین خداوندی کی خلاف ورزی کی ، قانون قدرت کا منہ چڑایا ، بعض کا انکار

خود ان کے اپنے خدا ہونے کے ادعا میں جلوہ گر ہوا ، بعض اس لئے برباد ہوئے کہ ذوق مادہ پرستی نے ان سے انصاف کا شعور اور عدل کی میزان چھین لی - وہ دوسروں کے حق میں بے رحم اور ظالم ثابت ہوئے اور پھر اسی بے رحمی اور ظلم کی پاداش نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر پیٹ ڈالا ، جس بھی معاشرے کے افراد نے راہ عدل سے عدول کیا اس معاشرے میں لوٹ کھسوٹ ، غارت گری ، افراتفری اور خونخواری در آئی — قرآن کی رو سے ہر صاحب وحی جو وحی لایا اس کی تلقین یہی تھی اور مقصد بھی یہی تھا کہ اولاد آدم کو متوازن حیات کا شعور اور پیمانہ میسر آ جائے تاکہ آدم خاکبازی سے بلند ہو سکے - مادے ہی سے چپک کر نہ رہ جائے - جب آدم محض زمینی ہو کر رہ جائے اور اس کا روحانی جذبہ دب جائے ، تو وہ اعلیٰ انسانی اقدار کی سمجھ بوجھ ہی سے محروم ہو جاتا ہے - اس کی حیات اخلاقی بے عنوانی کے ریلے میں بہہ جاتی ہے - ہر وحی الہیٰ کا تقاضا تھا کہ انسان مادے سے بلند تر ہو کر اور مادے پر حکمران ہو کر روح کے تقاضے پورے کرے اور ثابت کر دکھائے کہ وہ نباتات ، جمادات اور حیوانات کی ہم سطح ہستی نہیں ہے - اس کی حیات حکم خداوندی کے تابع ہے - وہ حاکم بھی ہوتا ہے تو حکم اس کا نہیں ہوتا ، حکم خدا ہی کا ہوتا ہے - قرآن نے بار بار بالاصرار اولاد آدم کو متوجہ کیا ہے کہ مطالعہ کائنات کے باب ماضی کے ضمن میں بصیرت اور دانش و حکمت کو کام میں لائے -

تقی الدین مقریزی (۸۴۵ ھ) نے اپنی کتاب ''الخطط'' میں لکھا ہے کہ :

'' فی الجملہ علم کی دو قسمیں ہیں ، عقلی اور نقلی ، انسان کو چاہیے کہ جب دونوں علوم حسب ضرورت اچھی طرح سیکھ لے تو پھر تمام تر تاریخ کے مطالعے میں

کھو جائے اور اس کی عبرتوں پر غور کرے — اللہ تعالیٰ جس کے دل کا پٹ کھول دیتا ہے اور آنکھوں سے پردے ہٹا دیتا ہے اس کو غور و فکر کے نتیجے میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے انسانوں کو جو دولت اور فوجی طاقت پر اترائے تھے بالآخر کس بربادی سے دو چار ہونا پڑا ،، [1]

یہی مصنف یعنی تقی الدین مقریزی اپنی کتاب ،، العقود الفریدہ،، میں لکھتے ہیں :-

،، اللہ تعالیٰ مخلوق کو نسلاً بعد نسل اور پے در پے قبیلوں میں آباد کرتا چلا جاتا ہے ، اس کی غرض یہ ہے کہ اگلے لوگ پچھلوں کے لئے اپنے قصے بطور عبرت و نصیحت چھوڑ جائیں اور پچھلے لوگ اگلوں کی یاد تازہ کرتے رہیں تاکہ سمجھ دار لوگ مذموم باتوں سے باز رہیں اور ان سے نفرت کریں اور با ادب حضرات ان اخلاق کی پیروی کریں جو اچھے اور پسندیدہ ہوں ،، [2]

ایک اور مورخ البدر حسین الاَھدل ،، تحفہ الزمن فی تاریخ سادات الیمن ،، کے شروع میں علم تاریخ سے متعلق اس رائے کا اظہار کرتے ہیں :-

،،یہ بڑا مفید علم ہے ، اس کے ذریعے خلف کو سلف کے حالات معلوم ہوتے ہیں اور راست باز لوگ ظالموں سے ممتاز ہو جاتے ہیں ، مطالعہ کرنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ عبرت حاصل کرتا ہے اور گذشتہ لوگوں کی عقل و دانش کی قدر پہچانتا ہے اور بہت سے دلائل کا پتہ لگا لیتا ہے ، اگر

۱-الاعلان بالتوبیخ ، اردو ترجمہ ، مرکزی اردو بورڈ ، لاہور ، ص ۸۶
۲-ایضاً ، ص ۸۸

یہ علم نہ ہوتا تو تمام حالات ، مختلف حکومتیں ، حسب و نسب اور سبھی علل و اسباب نامعلوم رہتے اور جاہلوں اور عقلمندوں کے مابین تمیز ہی باقی نہ رہتی ، چنانچہ مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات کی ایک پوری کتاب ایسی اتاری ہے جس میں گذشتہ قوموں کے حالات اور ان کی زندگی کی مدت اور نسب کا بیان ہے [۱] ،،

ابو علی احمد بن محمد بن یعقوب الرازی مسکویہ کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے قوموں کے حالات اور بادشاہوں کی سیرت کا غور سے مطالعہ کیا اور شہروں کی خبریں اور تاریخ کی کتابیں پڑھیں تو دیکھا کہ ان سے متعدد ایسے امور کا تجربہ حاصل ہوتا ہے جو بار بار رونما ہوتے ہیں - اور جن سے ملتے جلتے واقعات کا ظہور پذیر ہونا کسی بھی وقت متوقع ہے ، اس لیے انہوں نے اپنی کتاب ''تجارب الامم و عواقب الہمم ،، تصنیف کی ، یہ چار جلدوں میں ہے - [۲]

ان حوالوں سے ضمناً ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان مورخین کے یہاں تاریخ محض سلاطین اور حکام کی تاریخ سلطنت و حکومت نہیں — وہ قوموں کی کہانی ہے ، جن میں بادشاہ بھی شامل ہیں — وہ قوموں کے اخلاق اور کردار کی کہانی ہے -- وہ ان کی عقل و دانش اور فضل و کمال کی کہانی ہے - نیز وہ ان کے اجتماعی عروج و زوال کی کہانی ہے - وہ اسباب جو بار بار پیدا ہو سکتے ہیں - اسی لیے ابن خلدون لکھتے ہیں -

'' فالماضی اشبہ بالآتی من الماء بالماء [۳] ،،

''پس عہد گذشتہ ،عہد آئندہ سے اس قدر مشابہ ہے کہ پانی پانی سے بھی اس قدر مشابہ نہیں ہوتا ،،

۱- الاعلان بالتوبیخ ، اردو ترجمہ ، مرکزی اردو بورڈ- لاہور ، ص ۸۹
۲- ایضاً ، ص ۹۳
۳- مقدمہ المکتبہ التجاریہ شارع محمد علی ، مصر ، ص ۱۰

ابنِ خلدون کے نزدیک بھی تاریخ کی تعریف تقریباً وہی ہے جو دیگر مسلمان مورخین نے بیان کی ہے - البتہ وہ اس امر پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ مطالعہ تاریخ گہرے غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے تاکہ سچائی تک رسائی حاصل ہو - حقائق اشیاء واضح ہوں - پتہ چلے کہ تخلیق اشیاء کا آغاز کیونکر ہوا - تاریخ اس عمیق علم کی طالب ہے جس سے واقعات کے علل و اسباب سے آگاہی حاصل ہو — ابنِ خلدون زور دے کر کہتے ہیں کہ ''اسی سبب سے تاریخ کی جڑیں فلسفے میں راسخ ہیں اور وہ مستحق ہے کہ اسے فلسفے ہی کا ایک شعبہ قرار دیا جائے ''

''فهو لذلک اصیل فی‌الحکمة و عریق ، وجدیربان یعد فی علومها و خلیق[1]'' ہیگل کہتا ہے:

''فلسفہ تاریخ یہی ہے کہ تاریخ کا مطالعہ غور و فکر کے ساتھ کیا جائے'' [2]

حق یہ ہے کہ مطالعہ قرآن کی بدولت کائنات اور اہل کائنات کے باب میں ایک مخصوص نظریہ اور رویہ عمل میں آ جاتا ہے ، اور اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے اور اصول ثابتہ کی روشنی میں بعض نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن بہت سے علوم اسلامی کا سرچشمہ ہے جن میں سے تاریخ ایک ہے -

فقیر سید وحیدالدین لکھتے ہیں :

''ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال) اپنی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام فرما تھے ، اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر ایک نئے ملاقاتی آئے ، ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں - اتنے میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کر دیا ، کہنے لگے ''آپ

۱- المکتبہ انتجاریہ ، شارع محمد علی ، مصر ، ص ۴

Philosophy of History, Dower Publications, New York, 1956. 2. P. 8.

نے مذہب ، اقتصادیات ، سیاسیات ، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں ان میں سب سے بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے ؟،، ڈاکٹر صاحب اس سوال کے جواب میں کرسی میں سے اٹھے اور نووارد ملاقاتی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں ، یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے ، دو تین منٹ میں واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اس کتاب کو انہوں نے اس شخص کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے فرمایا ''قرآن مجید،، [1]

باقی علوم سے فی الحال تعرض نہیں ، فی الحال تاریخ سے بحث ہے ۔ علامہ کے نزدیک ابن خلدون کی ساری تاریخی بصیرت کا سرچشمہ قرآن ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ ابن خلدون علم الاجتماع کا بوا آدم گردانا جاتا ہے ، اس کا شمار فلسفہ تاریخ کے اساطین میں ہوتا ہے علامہ کے الفاظ ہیں :

''لہذا اس سے بڑی غلط بیانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن پاک میں کوئی ایسا خیال موجود نہیں جو فلسفہ تاریخ کا سرچشمہ بن سکے ، حالانکہ بہ نگاہ حقیقت دیکھا جائے تو ابن خلدون کا مقدمہ سر تا سر اس روح سے معمور ہے جو قرآن کی بدولت اس میں پیدا ہوئی ، وہ اقوام و امم کے عادات و خصائل پر حکم لگاتا ہے تو اس میں بھی زیادہ تر قرآن پاک ہی سے استفادہ کرتا ہے ،، [2]

تقریباً جملہ مورخین اسلام اور اکثر و بیشتر مستشرقین اس امر کے قائل ہیں کہ اسلامی تاریخ کی ابتدا ، پرورش اور ترقی قرآن ہی کے باعث ہوئی ، حضرت علامہ کا بھی یہی نظریہ ہے ۔

۱- روزگار فقیر، (دسمبر ۱۹۶۳) ، ص ۹۲ ، ۹۳

۲- تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ص ۲۱۳

وہ فرماتے ہیں کہ واقعات کی صحت معلوم کرنے کا اصول قرآن کریم نے یہ کہہ کر قائم کر دیا کہ "جب کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو اچھی طرح چھان پھٹک کر لو"۔ اِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوا (سورہ ۴۹، آیت ۶) فاسق سے مراد ہے بے کردار اور بد عہد شخص، ایسا شخص جو اپنے غلط عمل کے باعث مقام اعتماد و اعتبار سے محروم ہو۔ علامہ ذرا آگے چل کے لکھتے ہیں:

"عالم اسلام میں تاریخ کی پرورش جس طرح ہوئی وہ بجائے خود ایک بڑا دلچسپ موضوع ہے، یہ قرآن پاک کا بار بار حقائق پر زور دینا اور اس کے ساتھ ساتھ پھر اس امر کی ضرورت کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات صحت کے ساتھ متعین ہوں، علی ھذا مسلمانوں کی یہ آرزو کہ اس طرح ان کی آئندہ نسلوں کو اکتساب فیض کے دوامی سر چشمے مل جائیں۔ یہ عوامل تھے جن کے زیر اثر ابن اسحاق، طبری اور مسعودی ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں، لیکن تاریخ سے دلوں کو گرمانا اور ان میں جوش اور ولولوں کا ابھرنا وہ ابتدائی مرحلہ ہے جس سے رفتہ رفتہ تاریخ کا نشوونما ایک علم کے طور پر ہوتا ہے، اس کے علمی مطالعے کے لئے بڑے وسیع اور بڑے گہرے تجربے کے ساتھ بڑی پختہ عقل عملی کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں زندگی اور زمانے کی ماہیت کے بارے میں بعض اساسی تصورات کا نہایت صحیح ادراک [1]"

گویا حضرت علامہ کے نزدیک تاریخ کے مطالعے کے لئے وسیع علم، تجربے اور پختہ عقل عملی کی ضرورت ہے اس لئے کہ تاریخ میں انسانی معاشروں کے جملہ شعبے آجاتے ہیں۔ تاریخ احاطہ پسند

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۱۳، ۲۱۴

علم ہے جو پوری زندگی کو محیط ہے ، فکری ، عملی حرفی ، صنعتی، تجربی ، ادبی ، مالی ، ملکی ، سیاسی ، اقتصادی ، دینی ، نظریاتی ، صنمیاتی ، الٰہیاتی غرض انسانی حیات کا کوئی شعبہ نہیں جس کی روداد تاریخ نہ کہلائے ، مگر یہ ساری ہمہ نوعی ، ہمہ رنگی اور ہمہ جہتی کاوشیں الگ الگ کچھ بھی ہوں ، کسی بھی درجہ بلند کی مالک ہوں اور کیسے ہی باریک اور لطیف تجزئیے کا ہدف کیوں نہ بنیں ، اس وقت تک معانی و مفاہیم سے بخوبی سرمایہ دار نہیں ہوتیں جب تک ان کے باہمی روابط و توافق کی حقیقت واضح نہ ہو حیات کی کلیت کے حوالے اور تصور کے بغیر تاریخ کا رخ اور مرتبہ ارتقا سمجھ میں نہیں آ سکتا ۔ ایک نا ملائم سی مثال یہ ہے کہ اگر ہاتھی ایک کل کی حیثیت سے ہماری معلومات میں داخل نہ ہو تو اکیلی سونڈ دکھا کر کوئی ہمیں سونڈ کے کوائف و وظائف لاکھ سمجھاتا رہے شرح صدر کے ساتھ کچھ پلے نہیں پڑے گا — اسی طرح زندگی کی کلیت سے کٹ کر نہ کوئی فلسفیانہ نظریہ سمجھ میں آ سکتا ہے ، نہ کوئی سیاسی انقلاب اور نہ کوئی اقتصادی تغیر ۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں :

"فکری ارتقا کو انسانی فعلیت کے دیگر پہلوؤں سے منقطع نہیں کیا جا سکتا ، تاریخ فلسفہ کی کتابیں ہمیں یہ تو بتاتی ہیں کہ مختلف قوموں نے کیا سوچا ہے لیکن ان مختلف معاشرتی اور سیاسی اسباب و عوامل کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات فراہم نہیں کرتیں جن سے فکر انسانی کا کردار متعین ہوا ہو ، فلسفے کی جامع تاریخ مرتب کرنا یقیناً ایک دشوار کام ہو گا لوتھر کی تحریک اصلاح کے قیمتی مضمرات کی مکمل وضاحت و صراحت کرنا محض ایک عالم دینیات کے بس کی بات نہیں ہمارا یہ رویہ رہا ہے کہ عظیم تصورات کو

انسان کی ذہنی فعلیت کے عمومی دھارے سے الگ کر دیتے ہیں ،، [۱]

اسی ذیل میں حضرت علامہ کا وہ خطبہ صدارت بھی آتا ہے جو انہوں نے ۱۱ جون ۱۹۳۲ء کو بیرون موچی گیٹ لاہور کے ایک جلسہ عام میں ارشاد کیا تھا ۔ یہ پنجاب کے مسلمانوں کا احتجاجی جلسہ تھا ۔ جس کا باعث یہ ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی کے صدر شعبہ تاریخ پروفیسر بروس نے ہندؤں کے زیر اثر ، جن کا پنجاب یونیورسٹی سینٹ پر قبضہ تھا ، یہ تجویز پیش کر دی کہ ہندوستانیوں کو فقط ہندوستان کی تاریخ پڑھنی چاہئیے لہذا اسلامی تاریخ نصاب سے خارج کر دی جائے ۔ علامہ کے نزدیک اس ضمن میں محکم استدلال یہی تھا کہ تاریخ کسی ایک علاقے کے باشندوں کی تاریخ نہیں۔ تاریخ تو پورے عالم انسانیت کی اجتماعی دولت و میراث ہے۔ حضرت علامہ کے الفاظ یہ ہیں :

''واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے روح انسانی کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے ، اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے ۔ میں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کیتانی ملا ، وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ ہے ، اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ صرف کیا ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی ۔ اس نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے تاریخی مواد جمع کیا ہے ۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ سے دلچسپی کیوں ہے تو انہوں نے کہا اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے،، [۲]

---

۱ - شذرات فکر اقبال (مجلس ترقی ادب لاہور) ص ۱۱

۲ - گفتار اقبال ۔ ادارہ تحقیقات پاکستان ، دانشگاہ پنجاب ۔ لاہور ص ۱۵۳ ، ۱۵۴

ایک شخص اٹلی کا باشندہ ہے اسے ان علاقوں میں سے کسی علاقے کا باشندہ قرار نہیں دیا جاسکتا جن کو کبھی بھی اسلامی علاقے کہا گیا ہو ، پھر وہ مسلمان بھی نہیں کہ عقیدے کی کشش و برکت کے سبب سے اس کو تاریخ اسلام سے یہ شغف رہا ہو ، سیدھی سی بات ہے کہ ملکوں کی سرحدیں مادی نقوش ہیں ۔ اس کے برعکس تاریخ انسانی روح کا ثمرہ بھی ہے ، سرمایہ بھی ہے ، ترجمانی بھی ، تصویر بھی ہے ۔ روح کے عالم میں کوئی سرحد نہیں پائی جاتی ۔ مکانی سرحدیں تو رہیں ایک طرف تاریخ کے لئے کوئی زمانی سرحد بھی نہیں ۔ زمانے کو ناپ کر اور کاٹ کر ماضی کے مختلف ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ۔ ہم اپنی سہولت کے لئے تعیین زماں ضرور کرتے ہیں تا کہ متعلق دور پیش نظر رہے ، مگر نہ وہ دور کٹ سکتا ہے اور نہ اس دور کی نسبت سے وہ زمانہ کٹ کے اپنے دھارے سے الگ ہو سکتا ہے ۔ حضرت علامہ کا بڑا معروف شعر ہے :

زمانہ ایک ، حیات ایک ، کائنات بھی ایک

دلیل کم نظری ، قصۂ جدید و قدیم !!

حضرت علامہ کے نزدیک زندگی ایک مسلسل ارتقائی حرکت کا نام ہے ، اور زندگی کے میدان عمل میں انسان کی محنت و کاوش کے باعث اس کے جوہر کھلتے ہیں ، قرآن کریم کا ارشاد ہے ۔

"سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الارض" سورہ ۶۱ ، آیت ۱

(زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے)

دوسری جگہ آتا ہے ۔

تسبح لہ السمٰوات السبع و الارض و من فیھن ط ، و ان

من شیئٍ اِلّا یُسَبِّحُ بحمدہ ولٰکن لّا تَفقَہُوْنَ تَسبِیحَھُمْ

انہ کان حلیماً غفوراً ○ (سورہ ۱۷ ، آیت ۴۴)

(ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی بھی ان میں موجود ہے اسی کی پاکی (قدوسیت) بیان کرتے ہیں - اور کوئی بھی شے ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اس کی پاکی نہ بیان کرتی ہو یہ الگ بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں بیشک وہ بڑا حلم والا ہے - بڑی مغفرت والا ہے)

آیت کے آخری حصے کا مطلب ہے کہ وہ نظر و دانش رکھنے والوں کو مہلت دیتا ہے - سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا ، اور جب کوئی راہ راست پر آ جائے تو سابقہ خطاؤں سے در گزر کرتا ہے - مولانا عبدالماجد دریا آبادی اس آیت کے مطالب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

” ہر ایک مخلوق اپنے خالق کی قدوسیت کا اعلان اپنے مرتبہ و وجود کے متناسب و مطابق برابر کرتی رہتی ہے ، خواہ زبان سے ہو - خواہ زبان حال سے — موجودات عالم کا ذرہ ذرہ اپنے حدوث و امکان کی بنا پر صانع مطلق کے نہ صرف وجوب وجود کی بلکہ یکتائی ، صناعئی قدرت کی بھی شہادت اعلانیہ دے رہا ہے محققین عارفین نے تصریح کی ہے (اور یہی بات دل کو لگتی بھی ہے) کہ آیت میں لفظ تسبیح اپنے عموم کے ساتھ تسبیح قالی اور حقیقی ، اور تسبیح حالی اور حکمی دونوں پر شامل ہے ، مطیعین کی تسبیح حقیقی و قالی ہوتی ہے غیر مطیعین کی صرف حالی ،، ۱

”سبح،، سے دوڑنا بھی مقصود ہے ، تیرنا بھی ، مصروف عمل ہونا بھی ، عبادت کرنا بھی - اور ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر چیز تعمیل حکم الٰہی میں سرگرم ہے ، جس کی جو ڈیوٹی مقرر ہے وہ بکمال ذوق اطاعت ادا ہو رہی ہے -

ساتھ ہی ساتھ ہر شے اپنی تکمیل کے در پے ہے ،

۱۔ تفسیر ماجدی ، تاج کمپنی لاہور ۱۹۵۲ء ص ، ۵۸۶ ۰ ، ۰

نئی نئی چیزیں نمودار ہو رہی ہیں اور پھر خامی کے درجے سے بڑھ کے پختگی کے درجے کو پا رہی ہیں ۔ حضرت علامہ نے بزبان دوران ، زیر عنوان ''زمانہ'' فرمایا ہے :

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ
نہ تھا اگر تو شریک محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر سے شبانہ

وقت کے ساتھ ساتھ عالم امکان میں ہر شے اپنی آخری تقدیر کی تلاش میں ہے ۔ لہذا اولاد آدم کو بھی ہر لحظہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی کائنات میں اپنی سیادت قیادت اور سطوت کو برقرار رکھنے کی خاطر مسلسل جدوجہد کرنا پڑتی ہے ۔ اسے آگاہ و بیدار رہنا پڑتا ہے ، زمانہ ہر دم نئے امتحان سے دو چار کرتا رہتا ہے اور ہر دم ترقی کی طرف قدم اٹھانے پر اکساتا رہتا ہے ، جو غافل ہوا مغلوب ہو گیا جو کاہل ہوا محروم رہ گیا ، جو آگاہ اور مستعد و عمل پیرا رہا ، آئین فطرت کے مطابق اپنے کارواں کا سالار ٹھہرا ، زمام زمانہ اس کے ہاتھ رہی ، بقول حضرت علامہ :

ہے دوڑتا اشہب زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا ، کچل گئے ہیں

اس ضمن میں حضرت علامہ کی تصریح بہ اسلوب نثر ملاحظہ ہو

''بہر حال اسلامی فکر نے جو راستہ اختیار کیا اس کی انتہا جس پہلو اور جس رنگ میں بھی دیکھئیے کائنات کے حرکی تصور پر ہوئی اور پھر جسے ابن مسکویہہ کے اس نظریے سے کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے ، مزید تقویت پہنچی ، علیٰ ھذا

ابنِ خلدون کے نظریہ تاریخ سے قرآن پاک نے تاریخ کو "ایام اللہ" سے تعبیر کیا ہے، اور اسے علم کا ایک سر چشمہ قرار دیا ہے۔ اس کی ایک اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اقوام و ملل کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے کیا جاتا ہے، مزید یہ کہ انہیں اپنی بد اعمالی کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور یہ وہ بات ہے جس کے ثبوت میں اس نے بار بار تاریخ سے استناد کیا" ۱

چند سطور آگے چل کر حضرت علامہ "ولکل قوم اجل" کی روشنی میں کہتے ہیں کہ اس آیت کو پیش نظر رکھیں تو:

"اس کی حیثیت ایک مخصوص تعلیم کی ہے۔ جس میں گویا بڑے حکیمانہ انداز میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ امم انسانی کا مطالعہ بھی ہمیں بطور اجسام نامیہ، علمی نہج پر کرنا چاہیے۔"

ظاہر ہے کہ امم انسانی کی حیثیت اگر اجسام نامیہ (organisms) کی ایسی ہے اور امم امم کے ساتھ مربوط چلی آ رہی ہیں تو تاریخ انسانی ترقی کی ایک مسلسل حرکت ہے جس کو ماضی اور حال اور مستقبل کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ بیج پودے میں شامل ہے، بیج اور پودا درخت میں شامل ہے۔ ایک بچہ جب لڑکپن کی عمر کو پہنچا جب بھی وہ اصلاً وہی وجود تھا جس نے جنم لیا تھا اور جب وہ بھر پور جوانی سے سرمایہ دار ہوا تو جب بھی وہ اصلاً وہی تھا، اس میں بچہ بھی شامل تھا اور لڑکا بھی، یہی حال اقوام و ملل کا ہے بلکہ اجتماعاً پوری اولاد آدم کا ہے۔

اور یہ واضح ہے کہ جب ہم تاریخ کہتے ہیں تو مراد آدم کی تاریخ ہوتی ہے اور اگر آدم نہ ہو تو نہ نظر ہے نہ بصر نہ جذبہ

۱- تشکیل جدید، ص ۲۱۲

ہے نہ احساس ، نہ شعور نہ حواس ، نہ اشیا کا علم اور نہ ان کے خواص کا ، نہ اشیاء کے ربط باہم سے آگاہی اور نہ خواص کے اختلاط سے واقفیت ، نہ رنگ نہ ڈھنگ ، نہ کیف نہ آہنگ ، نہ سرور نہ مستی ، نہ فتح نہ شکست ، نہ خوشی نہ غم ، نہ حسن اور نہ عشق ، مولانا روم نے بجا فرمایا تھا :

باده از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما هست شد نے ما ازو

گویا جملہ معیارات کا مالک بھی آدم اور ناقد بھی ، تجربہ بھی وہی کر سکتا ہے ، تجزیہ بھی وہی کر سکتا ہے ، داد بھی وہی دے سکتا ہے ، سیکھ بھی وہی سکتا ہے ، سکھا بھی وہی سکتا ہے آدم کو اس سین سے اس منظر سے ہٹا دیں تو نہ کیف اور نہ کم ۔ اس کیفیت کو حضرت علامہ نے شعر ذیل میں پیش کیا ہے :

قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

دوسری جگہ بحضور خدائے تعالی گزارش کی ہے :

نمی بینی کہ ما خاکی نہاداں
چہ خوش آرا ستیم ایں خاکداں را

اور یہ آدم ہی کی کاوش ہے ، مشقت ، عرق ریزی اور خوں فشانی ہے جس نے دنیا کو آب و رنگ اور کیف و آہنگ عطا کیا ، اور اسی کدو کاہش لا زوال میں اس کی زندگی کا مزا ہے اور اس کی ہستی کا مفہوم پوشیدہ ہے ۔ بے تابی کی یہی لذت صلہ بے تابی بھی ہے :

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

حضرت علامہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں خدائے ''ایام اللہ''

سے اس طرح تعبیر کیا ہے :

''و ذکّرھم با یام اللہ'' (آیت ۵ ، سورہ ۱۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے کہا کہ ''انہیں (بنی اسرائیل کو) ایام خداوندی یاد دلا دے'' — یعنی یاد دلا دیا جائے کہ ماضی میں اللہ نے اپنی قدرت کاملہ کے کیا کیا جلوے دکھائے ہیں ۔ اس نے نعمتوں سے نوازا ، اس نے شکر گزاروں کو عزت و عظمت پر فائز کیا ، اس نے کفران نعمت کرنے والوں کو سزا دی ، سزا کے کئی رنگ تھے ۔ ایک سزا جو بہت بڑی اور طویل تھی وہ غلامی تھی — وغیرہ ، گویا ایام گذشتہ کے تمام اہم احوال اور واقعات جو عبرت آموز بھی ہیں اور حوصلہ افزا بھی ، ذہن میں تازہ رہنے چاہیں ، لب لباب یہ کہ تاریخ کی حیثیت اہل نظر افراد انسانی کے لیے ایک لائحہ عمل ، ایک جو لا نگاہ امکان ، ایک تازیانہ عبرت اور ایک جرأت آموز درس ہے تاکہ آدمی ہر لحظہ اپنے کردار اور اپنے روئیے کا جائزہ لیتا رہے۔ دم بدم دیکھتا رہے کہ وہ رو بہ ترقی ہے یا ٹھہراؤ کا شکار ہے یا زوال کے رخ رواں ہے ۔ اگر اس طرح آدم خود آگاہ رہے ، تو یقیناً پھر وہ بہتر سے بہتر آدمی بننے کی خواہش سے محروم نہیں رہ سکتا ، زندہ تمنا حرکت پر آمادہ کئے رکھتی ہے ۔ اگر زمان کو ایک زندہ حقیقت کے بطور تسلیم اور قبول نہ کیا جائے تو حضرت علامہ کا فلسفہ خودی سر تا سر بے مدار ہو کر رہ جاتا ہے ۔ تکمیل خودی یا تکمیل انسانیت کسی بے نمو اور بے حرکت و ارتقا آفاق میں بے معنی بات ہے

حضرت علامہ کو نظریہ خودی پر جو ایمان ہے اس کی روشنی میں پوری کائنات محشرستان اضطراب دکھائی دیتی ہے :

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر زرہ کائنات

ایسے بے سکون اور پر اضطراب ماحول میں آدم کو چین کیوں کر نصیب ہوسکتا ہے ۔ اس کے مقاصد کی تکمیل ہو تو چین میسر آئے ۔ منزل مقصود پر پہنچے تو آسودگی سے ہمکنار ہو ۔ لیکن اگر سکون میسر آ گیا تو پھر زندگی میں باقی کیا رہا ؟

همه سوز نا تمام همه درد آرزویم
بگمان دهم یقین را که شهید جستجویم

جیسا کہ شروع میں مقریزی ، الاھدل اور ابن خلدون کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے قرآن کے نزدیک، عہد ماضی کی داستان محض دل لگی کا سامان نہیں بلکہ یہ ایک ایسی داستان ہے جس میں سب سے اہم درس ''فاعتبرو یا اولی الابصار،، کی صدا ہر دم گونجتی رہتی ہے ، حضرت علامہ کا نظریہ بھی دیگر مسلمان مورخین کی طرح تقریباً یہی ہے ۔ وہ ''اسرار و رموز،، چابکدستی سے سمجھاتے ہیں کہ تاریخ تجھے خود آگاہ کرتی اور تیرے خنجر خودی کے لیے فساں کا کام دیتی ہے ۔ وہ ایسی شمع ہے جو امتوں کے لیے ستارے کا کام دیتی ہے ، ماضی کو سامنے لا بٹھاتی ہے اور اس طرح ماضی کا رشتہ حال اور پھر حال کے بتوسط استقبال سے جوڑ دیتی ہے ۔ اس مفہوم کو حضرت علامہ نے ساحرانہ ایجاز کے ساتھ اشعار ذیل میں قلمبند کیا ہے ۔

چیست تاریخ ، اے ز خود بیگانۂ
داستانے ، قصۂ ، افسانۂ
این ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مرد راہ کند
همچو خنجر بر فسانت می زند
باز بر روئے جهانت من زند
شمع او بخت امم را کوکب است
روشن از وے امشب و هم دیشب است

چشم پر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را
سر زند از ماضی تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیات لا زوال
رشتہ ماضی ز استقبال و حال

قرآن کریم نے بار بار تلقین کی ہے کہ اہل ماضی کے احوال سے آگہی حاصل کرو ، دنیا میں گھومو پھرو ، یہ گھومنا پھرنا سیر برائے سیر ، یا سیر برائے تفریح نہیں - یہ گھومنا پھرنا اپنی دانش کو جلا دینے کے لئے ہے ، اپنے آپ کو آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈال کر کچھ سیکھنے اور سکھانے کے لئے ہے ، آثار ماضی کے نظارے محض ایک تماشا نہیں ان سے سبق حاصل کرو ، قرآن کا خطاب عام ہے ظاہر ہے کہ عام و خاص دونوں طرح کے ہر طرح کے افراد نبی آدم مراد ہیں حضرت علامہ کے جتنے بھی اقتباسات اوپر گزر چکے ہیں ان میں اقوام ، امم ، ملل کا ذکر کیا گیا ہے - یعنی حضرت علامہ کے نزدیک اہمیت سلاطین ہی کو حاصل نہیں - اس لئے کہ تاریخ بادشاہوں کی تاریخ نہیں ہاں تاریخ میں بادشاہ بھی شامل ہیں - آغاز مقالہ میں جو اقتباسات مسلمان مورخین کی تحریروں سے دئے گئے ہیں ان میں بھی قوموں اور جماعتوں وغیرہ کی بات کی گئی ہے - وہاں بھی تاریخ کو وابستۂ سلاطین نہیں بتایا گیا - مسلمانوں نے بادشاہوں ، بادشاہی درباروں اور متعلقہ کاروبار کو تاریخ کے گونا گوں پہلوؤں میں سے ایک پہلو جانا ہے اور وہ پہلو بھی زندگی کے شعبہ سیاست کا ایک حصہ ہے ، ساری سیاست نہیں ہاں سیاست کا نمایاں جزو یا غالب جزو کہہ لیجئیے علامہ کہتے ہیں :

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت
خراج شہر و گنج کان و یم رفت
امم را از شہان پائندہ تردان
نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت

علامہ کی رائے یہ کہ ہے " تاریخ ایک طرح کا ضخیم گراموفون ہے جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں "[1]

ہاں یہ الگ بات ہے کہ اکابر خواہ وہ سیاسی اکابر ہوں یا متاعی اور وسائلی اکابر ہر اجتماعی زندگی میں مؤثر عنصر کے مالک ہوتے ہیں ۔ ان کا رویہ دوسروں پر اثر ڈالتا ہے ان کے اسلوب زیر دستوں کے لیے صحیح اور غلط کا معیار بننے لگتے ہیں اس لئے کہ آدمی کی عام فطرت خام ، نقالی اور بھیڑ چال ہے ، یہ جوہر بدرجہ فراواں ہر فرد میں موجود ہوتا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قول منسوب ہے

"النَاس عَلی دین مُلُوکھُم"
(لوگ اپنے بادشاہوں کا طریق و اسلوب اختیار کر لیتے ہیں)

بادشاہوں کا اثر نیچے کو درجہ بدرجہ پہنچتا ہے اور درجہ بدرجہ اپنے رنگ میں رنگتا ہے — پھر اگر اوپر والوں کے یہاں انصاف ، انسان دوستی ، حیا اور شرافت موجود ہوتی تو نیچے تک نقال عوام کا چلن ایسا ہی ہو جاتا ، یعنی اچھائیاں بطور طرز مقبول (فیشن) اپنا لی جاتیں اور اگر معاملہ برعکس ہوتا تو برعکس ، اور یہ امر واضح ہے کہ اوپر والے بھی فطرتاً ہر وقت معرض خطر میں رہتے ہیں ۔ ان کی جوہری بہیمی خصلتیں بار بار سر نکالتی ہیں اور جب اخلاق گرفت کمزور پڑ جاتی ہے اور ضمیر و قلب کا تازیانہ تادیب کمزور پڑ جاتا ہے تو آدمی بظاہر تو آدمی ہی رہتا ہے مگر اندر سے بہیم اور حیوان وحشی میں

۱- شذرات اقبال ، ص ۱۴۰

تبدیل ہو چکا ہوتا ہے اور یہ تبدیلی اس طرح چپکے چپکے عمل میں آتی ہے کہ خود آگاھی کے معاملے میں غفلت کی پاداش پا کر آدمی اس مقام پر جا رہتا ہے جہاں وہ تن پروری کو ایثار جاننے لگتا ہے ہوس کا نام خدمت رکھ دیتا ہے - نتیجہ یہ کہ جملہ عناصر حرص و آز کا شکار ہو کر بے رحم اور خونخوار وجود میں ڈھل جاتا ہے - ایسے عالم میں بدی اوپر سے نیچے کو اترتی ہے ، آپا دھاپی اوپر سے چلتی اور رفتہ رفتہ سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ افراد انفرادی زندگی کی رو سے بھی اور اجتماعی زندگی کی رو سے بھی توازن سے محروم ہو جاتے ہیں - توازن سے محرومی بیماری ہے ، وہ بیماری جو موت سے ہمکنار کر دیتی ہے - عیاں ہے کہ اس خرابی کا سرچشمہ اوپر ہے ، جس میں سے سوتے پھوٹ کر نیچے کو آتے ہیں - اس درجہ بدرجہ وقار و اقتدار کو علامہ نے ''خواجگی'' سے تعبیر کیا ہے - ''خواجہ'' سے مراد شاہ بھی ہے - وزیر بھی ، حاکم بھی جاگیردار بھی ، صاحب اموال و جاہ بھی و علیٰ ھذا القیاس - قرآن کریم میں آتا ہے :

''وَ اذا اَرَدنَا اَن نہلک قَریۃ اَمرنَا مترفیھَا ففسقُوا فیھَا فحقَ علیھا القَولُ فدمرنَا ھا تدمیراً'' (سورہ ۱۷ آیت ۱۶)

(جب ہم کسی بستی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے دولتمندوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ بدکاری پر اتر آئیں چنانچہ وہ بدکاری کرتے ہیں پھر اللہ کا قول پورا ہو جاتا ہے لہذا ہم اسے تہس نہس کرکے رکھ دیتے ہیں)

ابھی اوپر حضرت علامہ کے خطبات میں سے ایک اقتباس درج کیا جا چکا ہے جس میں حضرت علامہ نے مطالعہ قرآن کی روشنی میں یہ استنتاج کیا ہے کہ قوموں کو ان کی بد اعمالی کی سزا انفرادی طور پر بھی ملتی ہے اور اجتماعی طور پر بھی ، اور

وہ سزا یہاں اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے — قرآن کریم نے کئی موقعوں پر قوموں کے عروج و زوال کے کوائف بیان کئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی اکثریت بد کار ہوتی ہے تو قوم سزا کی مستوجب ہوجاتی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر اکثریت اچھے اور خوش عمل لوگوں پر مشتمل ہو اور ان میں ایک تعداد بد کاروں کی بھی ہو تو قانون فطرت اس قوم کو اجتماعی سزا نہیں دیتا ۔ ہاں وہ انفرادی سزا سے نہیں بچتے ، برا عمل تو خود اپنی ذات میں جانکاہ اور روح فرسا ہوتا ہے جو زندگی کو بھسم کر دیتا ہے ، نا فرمانی کی سزا اس کے علاوہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

ایک بات اور جو قرآن کے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے ، وہ یہ ہے کہ تاریخ آدم حیوانی جبلتوں اور انسانی روح کے مابین ایک مستقل کشمکش کا نام ہے ۔ بقول برگساں ارتقا زندگی کی اس جدوجہد کا نام ہے جو وہ مادے کے تسلط سے نجات پانے کی خاطر عمل میں لاتی ہے — مادہ مادے کی طرف کھنچتا ہے اور ظاہر ہے کہ انسانی وجود میں ٹھوس وزنی حصہ مادے ہی کا ہے اور وہی بالعموم حاوی رہتا ہے ۔ روح کی لطافت کو محنت سے تقویت دینا پڑتی ہے ، جب کہیں وہ وجود کے مادی حصے کو مادے کی نذر ہونے سے بچا سکتی ہے ۔ انسان ذرا غافل ہو تو نیچے کو چلا جاتا ہے ، جیسے کوئی بارودی ہوائی ، جب تک ہوائی میں بارودی تپش موجود رہتی ہے اس کا اوپر کی طرف سفر جاری رہتا ہے ۔ اور جب وہ تپش ختم ہو جاتی ہے تو پھر ہوائی ہوا میں معلق نہیں رہتی ، جبھی تو علامہ دعا کرتے ہیں :

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دل مرتضیٰ رض، سوز صدیق رض دے

ایک اور بات جو قرآن کے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ روح کی زندگی کی رہبری اور تقویت کے لیے ہر زمانے میں ہر قوم میں اللہ نے پیغمبر[۴] بھیجے جنھوں نے اپنے اپنے محدود دائرے میں اخلاق کی بگڑی ہوئی حالت کو سنوارنے کی کوشش کی ، جنھوں نے زندگی کی صداقتوں کا اثبات کیا اور ہر باطل کی نفی میں سرگرمی دکھائی اور آدم کو بہتر سے بہتر آدم بنانے کے لیے آئین و دستور دیا ۔ حضرت علامہ کے بقول اگر کائنات کی اساس کو مادی کے بجائے روحانی تسلیم کر لیا جائے تو بہت سی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں ۔ ہر پیغمبر نے اپنے اپنے دور میں اور اپنے اپنے دائرے میں مثبت قدروں کو اپنانے اور منفی قدروں سے اجتناب کرنے کی تعلیم دی اور ان پیغمبروں کی تعلیم اساساً ایک ہی جیسی تھی ۔ مگر جب کبھی اور جہاں کہیں وحی کا دیا ہوا ضابطہ رد کر دیا گیا یا اس کے نفاذ میں غفلت عمل میں آئی وہاں بربادی رونما ہوئی اور متعلقہ معاشرہ مٹ گیا ، حضرت علامہ کے یہ دو شعر اوپر گزر چکے ہیں :

سر زند از ماضی تو حال تو　　خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیات لازوال　　رشتہ ماضی ز استقبال و حال

یعنی تیرا حال تیرے ماضی سے پھوٹتا ہے اور حال سے استقبال سر نکالتا ہے ، اگر تو حیات لازوال کا خواہاں ہے تو پھر اپنے ماضی کا رشتہ اپنے حال و استقبال سے قطع نہ کر ، گویا ہمارا ماضی ، حال اور استقبال مربوط و مضبوط ہے ، ہم اپنے ماضی کو ساتھ لے کر آگے کو بڑھ رہے ہیں اس طرح دیکھیں تو احساس ہوگا کہ تاریخ ماضی اولاد آدم کا اجتماعی حافظہ ہے ، جس طرح فرد اچانک حافظے سے محروم ہو جائے تو بے معنی وجود سے زیادہ کچھ نہ رہے ، یہی حال قوموں کا ہے اگر وہ حافظہ کھو بیٹھیں تو مہمل ہو کر رہ

جاتی ہیں ، برگساں کے بقول :

"حافظہ محض ماضی بعید کی یادوں کو تازہ کرنے
کا عمل نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حافظے سے
مراد ماضی کا ہمارے ساتھ شامل "حال" ہونا ہے
اور ہمارے حال کو متاثر کرنا ہے" [۱]

یہاں جارج برنرڈ شا کا ایک قول یاد آتا ہے :

"تاریخ کا حال سے کیا کام ، جبھی تو بچوں کو معاصر تاریخ نہیں پڑھائی جاتی انھیں تاریخ اسی دور کی پڑھائی جاتی ہے جس کی سوچ ساقط الرواج ہو چکی ہوتی ہے اور جس کے احوال حقیقی عملی زندگی پر اطلاق پذیر نہیں ہوتے ، مثال کے طور پر انھیں تاریخ تو (جارج) واشنگٹن کی پڑھائی جاتی ہے مگر جھوٹ لینن کے بارے میں بولے جاتے ہیں - خود واشنگٹن کے زمانے میں ایسے ہی جھوٹ واشنگٹن کے بارے میں بولے جاتے تھے مگر تاریخ پڑھائی جاتی تھی کراموبل کی ، پندرہویں اور سولہویں صدی میں جون (Joan) کے بارے میں جھوٹ بولے جاتے تھے - ہاں اب اس کے بارے میں بھی سچ بولا جا سکتا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ سیاسی احوال و ظروف بدل جانے کے باوصف جھوٹ کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا" [۲]

سطور بالا میں تاریخ کا محدود سا نظریہ پیش کیا گیا ہے ، گویا معاصر تاریخ کا معنی بھی کسی سیاسی اہمیت کے مالک شخص کی تاریخ ہے اور ماضی کی تاریخ بھی کسی اہم شخص ہی کے گرد گھومتی ہے ، ہاں ایک بات بڑی حد تک درست ہے ، وہ یہ کہ

---

1. Masterpieces of World Philosophy Harper and Brothers, New York, 1961. P. 768.
2. Prefaces by Bernard Shaw Odhams Press, London, 1938. P 628.

معاصر اکابر کے باب میں سچ بولنے کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا ، ظالم کو عادل ، بخیل کو سخی ، ہونق کو افلاطون ، بے حس کو درد مند ، دین و دانش کے اندھے کو دیدہ ور ، وغیرہ کہا ہی جاتا ہے ، اور وہ لوگ جو مر جاتے ہیں ان پر تنقید کی جاتی ہے ، چھان پھٹک بھی فرمائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہم تاریخ پڑھا یا بتا رہے ہیں لہذا سچ کا دامن نہیں چھوڑ سکتے ، تیسری بات جو ''شا،، نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ سیاسی حالات کے بدل جانے کے باوصف جھوٹ کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا ، یہ مزے کی بات ہے جس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ معاصر مورخ اپنے معاصر اکابر یا حکام کے بارے میں اتنی گمراہ کن حکایات ، اطلاعات اور بے بنیاد واقعات ، خوف یا تعلق کے باعث قلمبند کر جاتے ہیں کہ مورخین مابعد سچ ڈھونڈنے کو نکلیں تو انھیں راہ نظر نہیں آتی ۔

پاسکل کا بڑا مشہور جملہ ہے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چھوٹی ہوتی تو دنیا کی ہسٹری اس سے مختلف ہوتی جو آج ہے ، درست کہ قلوپطرہ کے حسن نے سیزر ، اینٹونی ، آکیٹوین کے مابین مختلف النوع کش مکش کی صورت پیدا کی ، جنگیں ہوئیں ، موتیں ظہور میں آئیں سازشوں نے سر نکالا ، رومن سلطنت کے صوبے ہی نہیں مرکز بھی متاثر ہوا ، اگر رومن سلطنت کی یہ قوت قلوپطرہ کی ناک پر قربان نہ ہو جاتی تو نہ جانے اس سلطنت کے احوال کیا ہوتے اور آگے چل کے کیا کیا وسیع الاثر اور نہایت اہم نتائج برآمد ہوتے ۔ کیا پاسکل طنز کر رہا تھا ؟

ہاں مگر پاسکل نے بھی گویا ''شا،، کی طرح تاریخ کو حکام کی اداؤں اور غمزوں کے تابع کر دیا ۔ یہاں تک تو درست ہے کہ معاشروں میں انقلاب اور ہلچل افراد ہی پیدا کرتے ہیں مگر انقلاب اور شے ہے تاریخ اور شے ، تاریخ بہرحال صرف حکام اور سلاطین کی تاریخ نہیں ۔ تاریخ پورے معاشرے اور پوری اجتماعی

زندگی کی تاریخ ہے - اور وہ ایسی زندہ حقیقت ہے کہ سیاسی امور سے تعلق رکھنے والی تحریریں کمیاب بھی ہوں تو بڑا نمایاں فرق نہیں پڑتا ، تاریخ تو داستانوں میں بھی ملے گی ، شعر میں بھی ، لطائف میں بھی ، تعمیرات میں بھی ، تصاویر میں بھی ، صنائع میں بھی ، اسلحہ میں بھی ، ملبوسات ، ظروف اور زیورات میں بھی ، گزر گاہوں میں بھی ، میناروں میں بھی ، پہاڑی ٹروں میں بھی ، گونا گوں زندگی اور اس کے گونا گوں مظاہر سب کا مجموعہ تاریخ کہلاتا ہے سیاست اس کا ایک اور فقط ایک حصہ ہے - افراد معاشرہ کی امنگیں اور آرزوئیں مسائل اور مصائب ، محاسن اور معائب ، ولولے اور پریشانیاں ، یہ سب شاہوں کی پیدائش و وفات اور ان کے سال جلوس و انتقال کے مختلف معاملات ہیں - مگر قرآن نے جہاں بھی کسی قوم کے عروج و زوال کی کہانی سنائی ہے وہاں عموماً ان کے اجتماعی کردار اور معاشرتی احوال کو حوالہ بنایا ہے - ان کے بادشاہوں اور حکام کی جانب اشارہ کم ہی کیا ہے - مسلمان مورخین کا رویہ بھی عموماً یہی رہا ہے انھوں نے تاریخ کو کبھی بادشاہوں کی تاریخ نہ جانا ، خلیفہ ، بادشاہ ، حاکم وغیرہ تاریخ کا ایک حصہ ضرور ہیں اس لیے کہ معاشرے کی اجتماعی زندگی میں وہ بھی شامل ہیں تاریخ کا آئینہ بہرحال اجتماعی زندگی ہے - اور یہی حضرت علامہ کے پیش نظر ہے - ان کا یہ قول پہلے نقل کیا جا چکا ہے :

> ”واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے ، انسانی روح کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے“ -

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ کی اس تقریر کا اقتباس پیش کر دیا جائے جو انھوں نے نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبا کی طرف سے عرض کردہ سپاسنامے کے

جواب میں کی تھی - اس اقتباس سے حضرت علامہ کا نظریہ تاریخ اور اس نظریئے کا قرآن کریم پر استوار ہونا مزید واضح ہو جاتا ہے :

"ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے - میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں - میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں ، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمہ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے - یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں ، چونکہ ہم جدید تہذیب و شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں اس لیے ہم علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے پڑے ہوئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں - ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی عائد کیا گیا ہے ، یہ وہ نعمت ہےجو قرآن شریف نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے ، اس طریقہ استقرائی کے نتائج و ثمرات ہم کو آج نظر آ رہے ہیں - میں گذشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں ، ہر روز تلاوت کرتا ہوں - مگر میں ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں - اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات پر قلمبند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطمح حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے - [1]

1. گفتار اقبال ' ادارہ تحقیقات پاکستان ' دانشگاہ پنجاب لاہور ص ۱۰۴ ، ۱۰۵

علامہ اقبال ۔ مرد یقین

قرآن حکیم کا ارشاد ہے :

''وَمِنَ النَّاسِ مَن یَعبُدُ اللہ عَلٰی حرف فان اصابہٗ خیرٌ اطمَئن بہ وَ ان اصابَتہٗ فتنۃ انقَلَبَ علٰی وَجھہ ، خسر الدُّنیَا وَ الاٰخرۃَ ذٰالِکَ ھُو الخسران المبین٥''

(سورہ ۲۲ ، آیت ۱۱)

(لوگوں میں وہ شخص بھی تو ہے جو اللہ کی بندگی کا دم بھرتا ہے مگر عین کنارے پر رہتا ہے ۔ اگر بھلائی اور خیر میسر ہے تو وہ اللہ کے ضمن میں مطئن ہے اور اگر آزمائش سے دو چار ہوا تو رو گردانی اختیار کر لی ۔ اس نے دنیا بھی گنوائی اور آخرت بھی یہی وہ خسارہ ہے جسے صریح خسارہ کہتے ہیں) ۔

حق یہ ہے کہ بنو آدم کی اکثریت کو اپنے نظریات و عقائد سے لگاؤ تو ہوتا ہے مگر وہ لگاؤ یقین کی صورت بالعموم اختیار نہیں کر سکتا ۔ قرآن کریم کی محولہ بالا آیت کریمہ میں خالق نوع انسان نے انسانی نفسیات کی ایک ننھی سی تصویر پیش کی ہے جو واضح کرتی ہے کہ وہ آدمی صحیح معنوں میں صاحب ایمان نہیں ہے جو مرد امتحان نہیں ۔ جو آزمائش اور ابتلا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا ، جو زبانی کلامی کسی اصول اور نظریئے کا ساتھ دیتا ہے مگر اس کا دل قائم نہیں ہوتا ۔ جب تک سب خیریت کا سماں رہے وہ حاضر ، وہ صاحب اصول ، وہ صاحب ایثار ، لیکن جونہی اس اصول اور نظریئے کی پاسبانی کے معاملے میں آزمائش و امتحان سے واسطہ پڑا وہ بھاگ کھڑا ہوا ۔ ایسا شخص کہیں کا بھی نہیں رہتا ۔ نہ بندوں کے اعتماد کے لائق نہ دنیا میں بھی عزت

پائے اور نہ اللہ کی رحمت کے قابل کہ اگلے جہاں میں نوازا جائے۔ اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ بقول حضرت علامہ:

زباں سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

حضرت امام احمد حنبل سے مروی ہے کہ ایک بدو نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "آپؐ نے فلاں کو نوازا اور مجھے محروم رکھا"۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا "وہ شخص مرد مومن ہے"۔ بدو نے کہا "میں بھی تو مومن ہوں"، آپ نے ارشاد فرمایا۔ "بھئی تم تو محض مسلم ہو کیا یہ ٹھیک نہیں؟" [1]

اس سے واضح ہوا کہ اقرار زبانی اور شے ہے اور تصدیق قلبی اور۔ قرآن پاک میں آتا ہے:

"قَالَتِ الاعرابُ آمنّا قُل لَم تُؤمِنُوا ولٰکن قُولُوا اَسلَمنَا وَ لَمَّا یَدخُلِ الایمَان فِی قُلُوبِکُم"
(سورہ ۴۹، آیت ۱۴)

"یہ — صحرا نشیں (بدو) کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ (اے رسولؐ) کہہ دیجئے کہ تم لوگ ایمان نہیں لائے۔ البتہ تم یہ کہو کہ ہم اسلام لائے، اس لیے کہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہوا ہی نہیں۔"

پتہ چلا کہ از روئے قرآن اسلام اور ایمان دو درجے ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کے بقول "ان الایمان غیر الاسلام" [2]۔ یعنی ایمان اور شے ہے اور اسلام اور، اوپر درج کردہ آیت قرآنی کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا معنی ٹھہرا نظریئے اور اصول

1۔ الغنیتہ لطالبی طریق الحق، الشیخ عبدالقادر الجیلانی، مصطفیٰ البابی، مصر، حصہ اول، ص ۶۳

۲۔ الغنیہ، ص ۶۲

کا تسلیم کر لینا ، اور ایمان کا مطلب ہوا نظریہ و اصول کا دل میں اتر جانا ۔ کسی امر کا زبانی تسلیم کر لینا ، مان لینا اور بات ہے اور اس پر پختہ اعتماد ہونا بالکل دوسرا مسئلہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو شے دل میں اترتی ہے وہی فکر و عمل کو متاثر کرتی ہے وہی شخصیت کو متغیر کرتی ہے ۔ اگر معاملہ اقرار زبانی سے آگے نہ بڑھے تو گویا جو کچھ زبان نے کہا یا مانا وہ صرف معلوم کا ایک حصہ اور جزو بن کر رہ گیا ، یعنی اس سے علم میں اضافہ ہو گیا اور بس ۔ اس اضافے سے طرز عمل متاثر نہیں ہوتا ، زندگی اور کائنات کے بارے میں نقطہ نظر نہیں بدلتا ، اعمال کو پختہ عقائد بدلتے ہیں ۔ حضرت علامہ کہتے ہیں :

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الہ الا
لغت غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی

یعنی توحید کو زبانی مان لینا کوئی اہمیت نہیں رکھتا ، اس کا مطلب سمجھ ہی میں نہیں آتا ، گویا کلمہ طیبہ کسی غیر زبان کا لفظ ہے ۔ عجم تو ایک طرف رہے ، اگر دل گواہی نہ دے تو لا الہ الا اللہ کا مفہوم خود عربوں پر بھی واضح نہیں ہوتا خواہ یہ کلمہ انہی کی مادری زبان کے حروف سے متشکل ہوا ہو ۔ اصل مسئلہ تو ہے ایک خدا کو مان کر جملہ دوسرے خداؤں سے عملاً منحرف ہونا ، اور حال یہ ہے کہ دنیا خداؤں سے بھری پڑی ہے ، آدم زاد کے ابنائے جنس قدم قدم پر کوس خدائی پیٹتے دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں کا رازق بھی جانتے ہیں ، محافظ بھی سمجھتے ہیں اور مالک بھی تصور کرتے ہیں ۔ جبھی تو حضرت علامہ نے متنبہ کیا تھا کہ اے مسلمان تو :

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

جھوٹے خداؤں کے حضور میں یہ عرض کرنا کہ اے فنا زاد فریب خوردہ انسانو ! تم بھی ہماری ہی طرح کی عاجز اور بے بقا مخلوق ہو اور تم بھی ہماری ہی طرح خدائے واحد کی شان خلاقی کا ایک ادنی مظہر ہو ، سہل معاملہ نہیں یہ بات فنا زاد مگر بزعم خویش خدائی قوتوں کے مالکوں کو سخت ناگوار گزرتی ہے ، وہ بے شک دل میں یہ محسوس کرتے بھی ہوں کہ وہ کہاں اور خدا کہاں مگر وہ کسی زیر دست کی زبانی یہ سننا برداشت نہیں کر سکتے کہ خدا ایک ہے - وہی رازق ہے ، وہی مالک ہے حیات و ممات اسی کے قبضہ قدرت میں ہے - ایسے قول اور اعلان کو ادنیٰ ادنیٰ سے افسران بالا یا آقایان ملازمت و خدمت ، چیلنج جانتے اور دعوت مبارزت تصور کرتے ہیں - بھلا کسی مہربان سے مہربان شخص بالا دست سے یہ کہہ دیکھئے کہ حضور والا خالق ہی رازق بھی ہے - آپ فوراً محسوس کریں گے کہ اس شخص بالا نے اسے ذاتی توہین پر محمول کیا ہے چنانچہ اس گستاخی کی سزا ضرور ملے گی ، انفرادی ، اجتماعی ، قومی اور بین الاقوامی ہر سطح پر یہی عالم ہے - بین الاقوامی بڑی طاقتیں کسی غریب اور بظاہر کمزور ملک اور قوم کی طرف سے حق حریت و خود رائی کے اظہار کو اعلان جنگ جانتی ہیں - اسی لیے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ''لاالہ الا اللہ،، کہنا بڑا ہی مشکل اور کٹھن کام ہے - وہ کہتے ہیں میں جانتا ہوں کہ اس عقیدے پر کاربند رہنے کی کیا قیمت ادا کرنا پڑتی ہے :

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا الہ را

وہ شے جو قوت عطا کرتی ہے ، اور جس کی بدولت لاالا کہنے والا ہر آزمائش میں پورا اترتا ہے وہ ایمان ہے - ایمان ایک مستقل سرشاری ہے ، یہ دھوپ چھاؤں کی کیفیت نہیں - یہ ''آنے والا ذھن

اور جانے والا دھن، نہیں ۔ یہ کنارے پر کھڑے ہو کر اقرار بندگی کرنے کی حالت نہیں ۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے :

یَا یُّھَا اَلَّذِینَ آمنُوا آمنوا باللہ وَ رَسُولہ ا (سورہ ۴ ، آیت ۱۳۶)

''اے لوگو جو ایمانَ لائے ہو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ بھی تو'' ۔

مراد ہے زبانی ایمان لانے کا دعویٰ کرنے والو ، از راہ قلب ایمان لاؤ ، اقرار زبان کافی نہیں ۔ پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ از روئے دل تصدیق کرو ۔ یہ تصدیق بالقلب اصل ایمان کی کیفیت ہے اور یہ وہ استقامت ہے جو ماسوا اللہ سے بے نیاز کر دیتی ہے خواہ عالم خوف ہو خواہ محل ہوس یا موقع امید ، اسی ایمان کے بے باک عملی اظہار کا نام یقین ہے اور وہی عشق ہے حضرت علامہ فرماتے ہیں :

یقیں مثل خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

دیکھتے بھالتے آگ میں کود پڑنا حضرت ابراہیمؑ کے یقین ہی کا بے باک اقرار و اظہار تھا ۔ ظاہر ہے کہ منزل یقیں پر پہنچ جانے والے صاحب حال کو درحقیقت وہ کچھ نظر آتا ہے جو منزل قال پر پڑے رہنے والے کو دکھائی نہیں دیتا ۔ ایک آنکھ بالصر ہے مگر ایک آنکھ بابصیرت ہے ، اور بصیرت بھی فائق اور غائر، جس کے بموجب صورت اشیاء وہ نہ رہے جو ظاہر کی آنکھ کو نظر آتی ہے ۔ گویا معیار بھی بدل گیا اور تخمینہ و تقدیر بھی، نتیجہ یہ کہ رویہ بھی بدل گیا اور انداز بھی ، عام لوگوں نے کچھ اور دیکھا مگر فائق بصیرت والے نے کچھ اور دیکھا ۔ چنانچہ ایک

جانب تو آگ میں کود جانے والا بے باک منظر تھا اور دوسری طرف حیرت و استعجاب کا عالم ،

حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں :

"حققوا الاسلام حتی تصلوا الی الایمان ثمر حققوا الایمان حتی تصلوا الی الایقان فحینئذ ترون ما لم تروہ من قبل الیقین تریکم الاشیاء کما ھی علی صور تہا یصیر الخبر د معاینۃ ، ھو یوقف القلب علی الحق عزوجل و یریہ الا شیاء منہ" [1]

"تم اپنے اسلام کو سچ مچ اسلام بناؤ تاکہ ایقان تک پہنچ سکو ، پھر ایمان کو سچ مچ ایمان بناؤ تاکہ ایمان تک پہنچ سکو ، جب منزل یقین تک پہنچ جاگے تو پھر وہ کچھ دیکھو گے جو پہلے نہ دیکھا تھا۔ تمہیں یقین اشیاء، کو اس طرح دکھائے گا جس طرح وہ از روئے صورت و اصل ہیں یعنی علم مشاہدہ میں تبدیل ہو جائے گا یقین قلب کو حق عزو جل کے باب میں قائم و برقرار کر دے گا اور اسے حقیقت اشیاء کا جلوہ بذریعہ خدا دکھائے گا "

عبارت بالا کا آخری حصہ واضح کر دیتا ہے کہ مقام یقین حاصل ہو جائے تو پھر قرار آ جانا ہے میری مراد ہے استقلال حاصل ہو جاتا ہے - پھر ایمان و اعتقاد میں اتار چڑھاؤ رونما نہیں ہوتا ، اور سبب ظاہر ہے کہ منزل یقین کا واصل حقیقت اشیاء و امور کو نور خداوندی کی روشنی میں دیکھتا ہے - منزل یقین سے ادھر ادھر کا مرحلہ ایمان بھی قلب کی تصدیق کا نام ہے اور وہ اقرار زبانی سے بالا تر مقام ہے تاہم ایمان میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے اور کمی بھی رونما ہوتی رہتی ہے - حضرت غوث الاعظم نے حضرت ابن عباس رض ، حضرت ابوہریرہ رض اور حضرت ابوالدردا رض کی زبانی نقل کیا ہے کہ "الایمان یزداد و ینقص" [2] یعنی ایمان بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے - فقط یقین ہی کا وہ مرحلہ ہے

۱- الفتح الربانی ، ص ۱۵۲

۲- الغنیہ ، مصطفی البابی ، مصر ، ص ۶۲

جہاں استقرار ہے - جہاں اتار چڑھاؤ کی کیفیت کا دخل نہیں - جس کا مطلب واضح ہے کہ صاحب یقین کا ارادہ کبھی نہیں ڈولتا ، اس کی امید کبھی یاس سے ملوث نہیں ہوتی ، اس کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آتی اور اس کے ثبات پر کبھی اضمحلال کا سایہ یا پرتو نہیں پڑتا - صاحب یقین کی نظر بالغ ہو جاتی ہے چنانچہ وہ وہ کچھ دیکھنے لگتی ہے جو دوسری نظریں نہیں دیکھتیں ، وہ منفرد ہوتی ہے - دوسروں کا استدلال اور صاحب یقین کا معائینہ ، دوسروں کی جستجو اور صاحب یقین کا مشاہدہ ، بغیر یقین یہ شعر نہیں کہا جا سکتا

عقل کا موجود اور ، عشق کا موجود اور
اشہد ان لا الٰہ ، اشہد ان لا الٰہ

حق یہ ہے کہ حضرت علامہ کو دولت یقین میسر تھی اور یہ کہ وہ آگاہ بھی تھے کہ انہیں بے مثل اور غیر مترقبہ نعمت ارزانی ہوئی ہے - انہیں بخوبی معلوم تھا کہ حق تعالی نے انہیں جس بصیرت سے نوازا ہے اس سے قوم کی کثرت کثیرہ محروم ہے- مثلاً فرماتے ہیں :

، دو صد دانا دریں گلشن سخن گفت
سخن نازک تر از برگ سمن گفت

ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت

لیکن ظاہر ہے کہ نہ یہ منزل یقین فوراً حاصل ہو گئی تھی اور نہ اس نور یقین کے اعلان کا یارا اور حوصلہ بسہولت عطا ہو گیا تھا - ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ کہہ رہے تھے :

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

ازاں بعد ، ایک مرحلہ وہ تھا جب آپ کی زبان سے نکلا تھا :

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں ذرا اور اسے تھام ابھی

مگر اس کے جلد ہی بعد وہ منزل آئی جب انہوں نے امت مسلمہ کو اس اعتماد کے ساتھ مخاطب کیا :

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

گویا ان کا پیغام اب خود ان کے نزدیک اس قابل تھا کہ اسے عام کر دیا جائے ۔ گویا ''خضر راہ'' کے آخری بند میں مندرجہ بالا شعر ظاہر کرتا ہے کہ وہ بصیرت جو علامہ کو حضور حق سے ارزانی ہوئی تھی اس کے اعلان کا اذن مل گیا تھا ۔ اپنے شعروں میں وہ قوم و ملت کے باب میں حوصلہ افزا مضمون کبھی کبھار پہلے بھی قلمبند کر دیتے تھے شعر بالا میں تو بالیقین وضاحت کر دی کہ میں کوئی ایسا مستقبل دیکھ رہا ہوں جو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے اگر غور کرو تو میرے کلام کے آئینے میں آنے والے دور کی ایک خوش آئند تصویر ، فی الحال دھندلی ہی سہی ، نظر آجائے گی ۔ علامہ اقبال کے لئے وہ تصویر دھندلی نہ تھی ورنہ وہ دعوت نظارہ کیوں دیتے ۔ دھندلی کا لفظ دیکھنے والوں کے معیار نظر کے مطابق استعمال کیا ۔ ہوتے ہوتے اپنی بصیرت پر اعتماد اس قدر بڑھ گیا کہ حضرت علامہ بحضور خدائے تعالیٰ برنگ دعا پکار اٹھے :

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کے بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

تقریباً یہی مضمون ساقی نامے میں دھرایا :

جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق ، میری نظر بخش دے

ایمان و یقین کی عطا کردہ اس بصیرت نے حضرت علامہ کو قلب مطمئن عطا کر دیا تھا چنانچہ وہ عمر بھر بظاہر مایوس کن احوال کے باوصف کبھی مایوس نہ ہوئے ۔ وہ ہمیشہ پر امید رہے اور جوں جوں عمر بڑھتی گئی اور جسمانی قویٰ مضمحل ہوتے گئے ان کی آرزو روشن تر اور امید محکم تر ہوتی چلی گئی اور روحانی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا ۔ وہ یہ مان ہی نہ سکتے تھے کہ اسلام مغلوب ہوسکتا ہے یا اہل اسلام زیادہ دیر تک غلام رہ سکتے ہیں ۔ یہ اس لئے ممکن نہ تھا کہ مسلمان تو خدا کے آخری اور اکمل پیغام کے حامل تھے اسلام حق ہے لہذا اس کی تقدیر غلبہ ہے ۔ انہوں نے ''شمع و شاعر،، میں کہا تھا :

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ہمیں معلوم ہے کہ''شمع و شاعر،، ''شکوہ،، ، ''جواب شکوہ،، اور ''خضر راہ،، وغیرہ نظمیں کس دور میں لکھی جا رہی تھیں ، یہ وہ دور تھا کہ مغربی استعمار نے مختلف اسلامی ممالک کو دبوچ لیا تھا ، لے دے کے ایک ترکی کا آزاد وجود تھا مگر اسے بھی مختلف یورپی قوتوں نے گھیر رکھا تھا ۔ طرابلس میں ترکوں کو شکست ہوئی ۔ بلقان میں بھی ترکوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ۔ ترکی سلطنت کے عام احوال ایسے تھے کہ گویا بس مٹنے ہی والی ہے ۔ اہل فرنگ اسے یورپ کا مرد بیمار کہا کرتے تھے ۔ عین اس دور میں حضرت علامہ نے ''شمع و شاعر،، میں یہ پر امید صدا قلمبند کی :

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہو گی ترنم آفریں باد بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آ ملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
بزم گل کی ہمنفس باد صبا ہو جائے گی

دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ، ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

یہ پر حماست و باہمت رجائیت محض خوش امیدی کے لمحاتی دورے نہ تھے جنہیں ہم انگریزی میں (Fits) کہتے ہیں - یہ مستقل کیفیت تھی اور جب تک اللہ کی ذات پر بھر پور ایمان نہ ہو اور آئین فطرت کو اللہ کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں نہ دیکھا جائے اسی پائیدار رجائیت کا سرمایہ لا زوال حاصل نہیں ہوتا - اور جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا کہہ یہی دور ''شکوہ،، اور '' جواب شکوہ ،، کی تحریر کا ہے ''جواب شکوہ،، کا ایک بند یہ ہے :

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں نکلنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستان خالی
گل برانداز ہے خون شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

اور بظاہر کیفیت یہ تھی کہ دنیائے اسلام بتدریج زوال کی طرف رواں تھی اور پریشانیوں نے سیاہ بادل پھیلا رکھے تھے خود اسی نظم میں حضرت علامہ نے اس امر کا ذکر بھی کیا ہے کہ بلغاریہ کے محاذ پر یعنی بلقان کی حدود میں یورپی عسا کر کی یورش جاری ہے مگر وہ یہ کہہ کر حوصلہ بندھاتے ہیں کہ یہ ہنگامے مسلم قوم کی آزمائش و امتحان کے لئے رونما ہو رہے ہیں تا کہ پتہ چلے کہ وہ کس قدر بیدار ہیں ۔ کس قدر قربانی دے سکتے ہیں ۔ ایسے دور پر آشوب میں ہی تو مسلمانوں کو ثابت کرنا ہے کہ کسی بھی مایوسی کے عالم میں اور کسی بھی شکست و نکبت کی کیفیت میں وہ اسلام کا دامن نہ چھوڑیں گے ۔ ورنہ اسلام تو اللہ کا نور ہے ۔ اسے مٹانا مقصود فطرت ہے بھی کہاں ؟ وہ کہتے ہیں :

ہے جو ہنگامہ بپا یورش بلغاری کا
غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا

تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا خود داری کا

کیوں ہراساں ہے صہیل فرس اعدا سے
نور حق بجھ نہ سکے گا نفس اعدا سے

قرآن حکیم کا ارشاد ہے :

”احسب النّاس ان یترکوا اَن یقولوا آمنا و ھم لا یفتنون،،

سورہ ۲۹ ، آیت ۲

”کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض اسی لئے چھوڑ دئے جائیں گے کہ وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ؟ کیا انہیں آزمایا نہیں جائے گا ،، ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

''الصبر من الایمان کالرأس من الجسد[۱]''

''ثبات و استقلال کا ایمان سے وہی تعلق ہے جو سر کا جسم سے'' ــ حضرت علامہ کے نزدیک فطرت مسلمانوں کا امتحان لے رہی تھی کہ آیا وہ ثابت قدمی کا اظہار کرتے ہیں یا نہیں اور آیا برے احوال میں مبتلا رہنے کے باوصف اسلام کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں یا ترک تعلق کر لیتے ہیں۔ آغاز مقالہ میں جو آیت کریمہ درج ہوئی وہ یہی تو ہے کہ ''سب اچھا ہے'' کی حالت میں لوگ اللہ کے بندے ہونے کا اقرار کرتے رہتے ہیں مگر جب آزمائش کا لمحہ آئے تو منہ موڑ لیتے ہیں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ــ گویا دیکھنا یہ تھا کہ مسلمان اسلام کے وفادار تھے یا غلبہ و سطوت اسلام کے، ''جواب شکوہ'' کا آخری شعر یہ ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں

حضرت علامہ اقبال کے نزدیک مقصود فطرت تو یہ امتحان تھا کہ مسلمان برے احوال سے دو چار ہو کر اور نکبت میں مبتلا ہو کر بھی دامن توحید و رسالت تھامے رہتے ہیں یا بیوفائی اور ضعف محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر مسلمان وفادار ہیں، ان کی محبت پائدار ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی سبب پیدا کر دے گا ''لَعَلَّ اللہَ یُحدِثُ بَعدَ ذٰلِکَ اَمراً'' ؟[۲] ''یعنی عین ممکن ہے اللہ اس کے بعد کوئی نئی صورت حال پیدا کر دے، جس کے باعث مشکلات دور ہو جائیں''

بات اصل یہ ہے کہ بندہ مومن مایوس ہوتا ہی نہیں۔ وہ گھبراتا ہی نہیں، اسے اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے اور وہ اہلیت و ہمت کے مطابق عمل پیرا رہتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

۱- الفتح الربانی، ص ۱۲۵
۲- سورۃ ۶۵، آیت ۱

الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا و قالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل ہ

(سورہ ۳ ، آیت ۱۷۳)

"(اہل ایمان) وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے لوگ یہ کہیں کہ لوگ (دشمن) تمہارے خلاف اکٹھے ہو چکے ہیں اور سامان و لشکر بھی جمع کر لیا ہے لہذا تم ان سے ڈرو تو ان کا ایمان الٹا اور بڑھ جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں ہمارے لئے خدا کافی ہے اور وہی سب سے بہتر پاسبان بھی ہے اور معتمد بھی"

یہ وہ ہے یقین جس سے ہر فرد بشر کو مالا مال ہونا چاہئیے - یقین وہ کیفیت ہے کہ اگر دل نشین ہو جائے تو پھر خوف اور سراسیمگی قریب نہیں پھٹکتی۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (اور دیکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں وہ نہ خائف ہیں ، نہ غم کھاتے ہیں) - حالات بظاہر کیسے ہی پریشان کن کیوں نہ ہوں مومن نہ گردن ڈالتا نہ ڈالتا ہے - اور نہ اس کی دلشکنی ہوتی ہے، مایوسی تو دور کی بات ہے ، حضرت علامہ فرماتے ہیں :

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے
ولایت ، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہے فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

اب ہم علامہ کی مشہور و معروف نظم "خضرہ راہ" کی طرف آتے ہیں - یہ نظم جنگ عظیم اول کے خاتمے کے بعد لکھی گئی تھی۔ اور عالم یہ تھا کہ دنیائے اسلام میں ایک بھی آزاد مملکت باقی نہیں رہ گئی تھی، ہمارے تمام جھنڈے سرنگوں تھے بلکہ سرے سے تھے ہی نہیں - جزیرۃ العرب پر سے ترکوں کا تسلط ختم ہو

گیا اور وہاں انگریزوں اور فرانسیسوں نے قدم جما لیے ، عراق ، اردن اور شام کا فلسطینی حصہ انگریزی اقتدار کی نذر ہوا فلسطین کے سوا سارا شام فرانسیسوں کے سپرد ہوا ۔ ایران کے جنوبی حصے پر انگریزوں کی فرمانروائی تھی اور شمالی حصے پر روس کی ۔ مصر و عدن ، ملایا ، نائجیریا وغیرہ بہت سے علاقے برطانوی اقتدار کی بھینٹ چڑھ چکے تھے ۔ برعظیم پاک و ہند کے مسلمان جن کی سطوت و شوکت کبھی پورے برعظیم میں جلوہ‌بار تھی اب برطانیہ کے کہنہ مشق غلام گنے جاتے تھے ۔ جزائر شرق الہند (انڈونیشیا) پر ہالینڈ والوں کا قبضہ تھا ۔ افغانستان کے حاکم کو ''امیر،، افغانستان کہتے تھے ۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو اسلامی ممالک دنیا کے نقشے پر نظر آ رہے ہیں اور جن کو آج محض حافظے کے زور پر گننا بھی محال ہے اس دور میں یہ سب کے سب غلام تھے ۔ گویا وہ دور مسلمانوں کے سیاسی انحطاط اور ہزیمت کا نقطہ آخریں تھا ۔ مگر حضرت علامہ نے ''خضر راہ،، میں جہاں اپنی ملت کے زوال و انحطاط پر فریاد بلند کی وہاں یہ بھی بتایا کہ بس اب نیا دور شروع ہونے ہی والا ہے ۔ زوال کی انتہا ہو چکی ۔ اب عروج کے آغاز کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ۔ انہوں نے فریاد اُن الفاظ میں کی تھی :

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز
حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جسطرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
بو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

یہاں تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے سے فریاد کا رخ کسی اور جانب ہو جاتا ہے ۔ علامہ بتا رہے ہیں کہ سطحی نظر سے تو

بے چینی اور بے تابی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ لیکن وہ شخص جو اللہ کے آئین جہانداری کو جانتا ہے وہ بخوبی سمجھتا ہے کہ آوازہ حق پھر بلند ہونے والا ہے ۔ مغرب کی باطل قوتیں مادی اقتدار کے بل بوتے پر اپنی انتہائی ترقی کی منزل تک پہنچ چکی ہیں ۔ اور اہل حق نے اپنی غفلت کے سبب اپنی نکبت کی آخری حد کو جا لیا ہے ۔ اب اس سے آگے کوئی گنجائش نہیں چنانچہ علامہ نے مولانا روم کے ایک مشہور و مقبول شعر میں بحر و وزن کے مطابق تبدیلی اور ترمیم کر کے وضاحت کر دی کہ جب کسی عمارت کو از سر نو تعمیر کرنا اور اسے مزید استواری سے مایہ دار کرنا مقصود ہو تو پہلے اس پرانے ڈھانچے کو ڈھا دیا جاتا ہے چنانچہ " مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز " کے بعد کہا :

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

ازاں بعد مسلمانوں کو تلقین فرمائی کہ واپس حصار دین میں آ جاؤ ۔ صفیں درست کرو ، نسل، رنگ ، خون اور علاقے وغیرہ کے حوالوں نے جو تعصب اور تنگ نظری پیدا کر دی ہے اسے ترک کر دو اور وہی جذبہ ایماں دوبارہ دلوں میں پیدا کرو جو اسلاف اہل اسلام کا نشان امتیاز و افتخار تھا اور پھر بڑے ہی پر امید لہجے میں کہا :

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں ، میرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

مسلمانوں کے اس عالم ہزیمت میں اسلام کے خواب حریت کے انکشاف و تعبیر کی خوش خبری دینا اس دور کے مسلمانوں کو خدا جانے کیا دکھائی دیتا ہو گا ۔عام مسلمان ممکن ہے اس انداز نظر کو محض علامہ کی شاعرانہ تمنا اندیشی پر محمول کرتے ہوں مگر علامہ تھے کہ پر یقین ، پر امید ، ہزاروں گمانوں کی یورش کے باوصف محکم الایمان تھے ، اور خوش آئند مستقبل کی خبر دئے جا رہے تھے ۔ انہوں نے بعد ازاں ''ساقی نامہ،، میں اس کیفیت کو ان الفاظ میں واضح کیا :

مری فطرت آئینہ روزگار
غزالان افکار کا مرغزار

یہ عام انسانی فطرت ہے ۔ مگر دل کا عالم یہ نہا :

مرا دل مری رزمگاہ حیات
گمانوں کے لشکر ، یقین کا ثبات

اصل بات یہی ہے کہ گمانوں کے لشکر یورش کرتے رہے مگر پائے یقین میں اضمحلال نہ آیا اس دولت یقین پر انہیں بھر پور بھروسا تھا اور ناز بھی ، جبھی تو کہا اے مولا ۔ اے میرے مولا ! میرا یقین ساری امت کو عطا کر دے ۔ اتنی بڑی دعا اور اپنے دل کی کیفیت کے حوالے سے ، معمولی جسارت نہیں :

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

مگر ہم ''ساقی نامہ،، سے لوٹ کر ''طلوع اسلام،، کی طرف چلتے ہیں جو ''خضرہ راہ،، کے جلد ہی بعد مطلع شہود پر جلوہ گر ہوئی - خضر راہ میں جس لے کو چھیڑا اور چھوڑا گیا تھا طلوع اسلام میں تان پھر وہیں سے شروع ہوئی - حضرت علامہ نے ''خضر راہ،، میں بتایا تھا کہ ملت اسلام کی عمارت از سر نو تعمیر ہونے والی ہے لہذا پرانی عمارت کو ویران کرنا پڑا اور یہ کہ حریت اسلام کا دور دورہ ہونے والا ہے - طلوع اسلام کا مطلع ہے :

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا . گیا دور گراں خوابی

یعنی وہی مضمون پھر بیان ہوا کہ ہمارے زوال کی انتہا ہو چکی ، اب عروج کی سمت آغاز سفر ہوگا ، پہلے مصرعے میں بڑی شاعرانہ چابکدستی کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ستاروں کی ضو ماند ہو جائے تو یہ مایوسی کا منظر نہیں ہوتا - درحقیقت یہ خوش خبری ہوتی ہے اس امر کی کہ صبح روشن طلوع ہونے والی ہے - مگر اگلے ہی شعر میں حضرت علامہ نے واضح کر دیا کہ اہل اسلام کی یہ کروٹ منطق اور فلسفے کے اصولوں اور فارمولوں کی رو سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں - یہ ایمان اور یقین کا مسئلہ ہے ، یہ روح اور وجدان کا معاملہ ہے - لہذا اہل منطق و فلسفہ بیشک عقل کی خوردبین لگا کے دیکھتے رہیں- رمز دین بڑی ہی باریک رمز ہے - یہ عقلی دلیلوں کے دام میں نہیں آتی :

عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

اس انقلاب کی لم اور اصول کو فقط اہل نظر ، اہل بصیرت ، اور دانایاں راز ہی سمجھتے ہیں - اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ عثمانی ترکوں نے اتا ترک اور عصمت انو نو کی قیادت میں اتحادیوں کی فوجوں کو مجتمعاً بھی اور یونانیوں کے عساکر کو علیحدہ

بھی پے در پے شکستوں سے دو چار کیا تھا اور کم از کم وہ سارے علاقے غیروں سے خالی کرا لیے جن میں آبادی کی اکثریت ترکوں پر مشتمل تھی ۔ اس طرح ترک ڈوبتے ڈوبتے پھر ابھر آئے ۔ اسی دوران میں شریف حسین والئی مکہ کے خلاف قلب عرب سے عبدالعزیز ابن سعود کی تحریک سر اٹھا رہی تھی ۔ اور انگریزوں کا ایجنٹ شریف حسین اپنے اقتدار کے سنگھاسن پر ڈولنے لگا تھا ۔ غرض ''طلوع اسلام،، میں انقلاب کے عملی آغاز کی تصویر پیش کی گئی ہے جس کی آمد کے باب میں حضرت علامہ قبل ازیں اشارے کرتے چلے آ رہے تھے ۔ وہ اشارے جو ایک صاحب دل اور صاحب نظر انسان کی پیشگوئیاں قرار دئے جا سکتے ہیں ۔ چنانچہ ''طلوع اسلام،، میں حضرت علامہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ اور بڑی سرشاری کے عالم میں اعلان فرمایا :

سر شک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

حق یہ ہے کہ حضرت علامہ کو اسلام کی حقانیت پر اس قدر محکم یقین تھا کہ انہوں نے ۱۹۱۹ء کے دسمبر میں ترکی خلافت کے تحفظ کے ضمن میں منعقد ہونے والے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

'' ہم کیوں کسی بندے کے سامنے شکایت کریں ۔ ہمیں خدا کے سامنے شکایت کرنی چاہیے ۔ منت، خوشامد یا مانگے سے کچھ نہیں ملتا ۔ خدا کے علاوہ کسی کی اطاعت ہمارے لئے واجب نہیں ۔ یاد رکھو کہ جو قوم ایک بڑا مقصود لے کر پیدا ہوئی ہے وہ یونہی نہیں مٹ سکتی ،، [1]

---

۱ ۔ انوار اقبال از بشیر احمد ڈار ، اقبال اکیڈیمی پاکستان ، ص ۴۳ ، ۴۴

اور یہ الفاظ مسلمانوں کے بارے میں اس وقت کہے جا رہے تھے جب دنیا بھر میں مسلمان مغلوب تھے اور بظاہر بالکل بے بس۔ علامہ تو اتنا جانتے تھے کہ وَکَلِمَۃُ اللہِ ھِیَ العُلیا (سورہ ۹ آیت ۴۰) غالب تو دین خدا ہی کو آنا ہے اور وہ غالب آکر رہے گا، علامہ مایوس ہو سکتے ہی نہ تھے، وہ کہتے ہیں:

نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت علامہ نے ''طلوع اسلام'' کے آخری بند میں صاف طور پر کہدیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تصرف روحانی شروع ہو چکا ہے، لوگ نہیں دیکھ رہے، میں دیکھ رہا ہوں:

بہ مشتاقان حدیث خواجہ بدرو حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بہ چشم آشکار آمد

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''میں نے کتابیں پڑھیں ہیں۔ باتیں سنی ہیں۔ صحبتیں اٹھائیں ہیں۔ زندگی دیکھی ہے، غور و فکر کیا ہے سب کا مجموعی اثر جو کچھ ہوسکتا ہے جسے میں تجربے کے وسیع مفہوم سے تعبیر کرتا ہوں یہ ہے کہ مسلمان جو کچھ ہی کیوں نہ ہو مسخر و مرعوب نہیں ہوتا، علم و فضل ہو، دولت و حشمت ہو، جاں سوزی و جاں بازی ہو وہ سمجھتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان وہ ان سب پر قادر رہا ہے اور رہ سکتا ہے'' [1]

ظاہر ہے کہ جو قوم کوئی مقصود لے کر پیدا ہوئی ہو وہ مایوسی کے حضور ہتھیار ڈال بھی کیسے سکتی ہے، غم کا عارضی منظر اہل ایمان کو نہیں ڈراتا، جبھی تو علامہ نے کہا تھا:

۱۔ اقبال شخصیت اور شاعری، اقبال اکیڈمی پاکستان، ص ۴

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے !
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

قرآن کریم کا ارشاد ہے :

''ھُوَ الَّذِی اَرسَلَ رَسُولَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِینِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّینِ کُلِّہٖ وَلَو کَرِہَ الْمُشْرِکُونَ ،، (سورہ ۹ ، آیت ۳۳)
''اللہ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سارے دینوں پر غالب کر دے ، خواہ یہ امر مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے ،،

حضرت علامہ فرماتے ہیں :

مقام شوق بے صدق و یقیں نیست
یقیں بے صحبت روح الامیں نیست
گر از ذوق یقیں داری نصیبے
قدم بے باک نہ کس در کمیں نیست

یہاں صدق سے مراد تصدیق قلب ہے ۔ اور صحبت روح الامین سے مراد قرآن سے آگاہی ہے یعنی جب تک قرآن میں سطور وحی سے یوں آگاہی نہ ہو جس طرح حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ہے تو بات نہیں بنتی ۔ وہی مفہوم جو شعر ذیل میں بیان ہوا :

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

حضرت علامہ کے یقین محکم کی کیفیت کو دیکھ کر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ قرآن کے مطالب ان کے دل پر براہ راست وحی ہوتے تھے ، ورنہ مایوس کن حالات میں امید و آرزو کا تسلسل اور کامگاری کے بارے میں پائیدار اطمینان ممکن نہیں ، عام انسانی فطرت ہے کہ کبھی مایوسی طاری ہو جاتی ہے کبھی امید جلوہ

دکھاتی ہے لیکن حضرت علامہ اسلام کے روشن مستقبل سے کبھی مایوس نظر نہیں آتے ، ذاتی احوال کے بارے میں اداسیاں اور آزردگیاں جو کبھی کبھی ان کے خطوط اور وہ بھی جوانی کے دنوں کے خطوط میں نظر آتی ہیں ان کا معاملہ بالکل جدا ہے - ایقان بالا سلام کے باب میں وہ کہیں بھی اور کبھی بھی ڈھلمل دکھائی نہیں دیتے -

"حضرت معاذ بن جبل کے پاس کوئی شخص آیا اور کہا آپ مجھے دو آدمیوں کے بارے میں آگاہی عطا کریں - ان میں سے ایک وہ ہے جو سرگرم عبادت رہتا ہے - (نیک) کام کاج میں جتا رہتا ہے - گناہ کا کم ہی مرتکب ہوتا ہے البتہ ضعف یقیں میں مبتلا رہتا ہے تشکک کی کیفیت اس پر طاری رہتی ہے - حضرت معاذؓ نے فرمایا اس کا تشکک اس کے عمل کو لے ڈوبے گا۔ اس شخص نے کہا اب مجھے آگاہی بخشیں اس شخص کے بارے میں جس کے نیک اعمال کم ہیں مگر اس کا یقیں قوی ہے - اور ہاں اس سے گناہ بھی بہت سرزد ہوتے ہیں۔ اس پر حضرت معاذؓ نے خاموشی اختیار کرلی۔ یہ دیکھ کر وہ شخص بولا خدا کی قسم اگر پہلے شخص کا تشکک اس کے اعمال خیر کی بربادی کا لازماً باعث بنے گا تو اس دوسرے شخص کا یقیں اس کے تمام گناہوں کا صفایا کر دے گا - یہ سن کر حضرت معاذؓ نے اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا میں نے اس شخص کے سوا کسی کو اپنے سے فقیہہ تر نہیں پایا [1]"

اس کہانی کے بعد حضرت علامہ کا شعر ذیل جو پہلے بھی کہیں اوپر درج ہو چکا ہے معانی کی روشن تر چاندنی بکھیرنے لگتا ہے :

۱- عوارف المعارف ، عبدالقاہر بن عبداللہ السہروردی ، دارالکتاب العربی بیروت ، ص ۴۲

مرا دل مری رزمگاہ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

لوتھراپ سٹاڈرڈ (Lothrop Stoddard) نے ۱۹۲۲ء میں ایک کتاب قلمبند کی تھی جس کا نام تھا "The New World of Islam" یہ لندن سے شائع ہوئی تھی - ابھی علامہ اقبال کی نظم "طلوع اسلام" کا ظہور نہیں ہوا تھا - مصنف نے اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اگرچہ عالم اسلام سیاسی اعتبار سے مغرب کا مغلوب ہو گیا ہے اور اس کی سیاسی سطوت قطعاً ختم ہو گئی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں نے اس صورت حال کو قبول کر لیا ہے - اس کے برعکس تمام عالم اسلام میں ایک شدید رد عمل ظاہر ہوا ہے جو اسلامی قومیت و ملت کے رنگ میں ابھر رہا ہے گویا بین الاسلامیت (Pan Islamism) پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ جلوہ گر ہے - اس کتاب میں تقریباً تمام عالم اسلام کا اضطراب خاطر زیر بحث آیا ہے بالخصوص شرق اوسط کے علاقوں عرب ، مصر اور ترکی ، ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی موقف اور بطور خاص تحریک خلافت کا دلچسپ ذکر ہے - سمرقند و بخارا کے مسلمانوں کی بے تابی خاطر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے - یہ کتاب پڑھ کر آج بھی مسلمان نوجوان کا خون گرما جائے - اس لیے کہ اس کے مطالعے سے اسلام کی دینی روح کے غیر مغلوب ہونے پر ایمان اور مستحکم ہو جاتا ہے - لوتھراپ سٹاڈرڈ نے جنگ عظیم کے خاتمے پر عالم اسلام کی سیاسی مغلوبیت کو بھی محض عارضی اور ظاہری کیفیت قرار دیا ہے - لوتھراپ محسوس کر رہا تھا کہ اسلامی منطقوں میں یورپ کی بالادستی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے گی اور اسلامی دنیا جلد رد عمل اور وہ بھی پر جوش رد عمل ظاہر کرے گی -[1]

1. The New world of Islam, Chapman & Ltd. London, 1922 P. 18, 19, 173, 199, 200.

یہی وہ روحانی اور سیاسی پس منظر تھا ۔ جس سے متاثر ہو کر علامہ نے فرمایا تھا :

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی ، ذہن ہندی ، نطق اعرابی

لیکن مغربی استعمار کی یلغار بھی لگاتار جاری رہی ۔ مغربی استعمار کو مادی قوت حاصل تھی ۔ نئی سائنسی ایجادات نے آدم کشی کے لیے نئے وسائل مہیا کر دیے تھے ۔ اہل افریقہ و ایشیا اس ضمن میں بہت پیچھے تھے لہذا پٹتے گئے ، اھل استعمار نے اپنی طرف سے بھر پور کوشش کی کہ اپنی مادی قوت کی چھتری کے زیر سایہ اپنا دین بھی پھیلائیں ، اپنے آداب بھی رائج کریں ۔ اپنی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بھی بنائیں اور ایسی تصانیف بھی مرتب کریں جو محکوموں کو اپنے ماضی سے بدظن کر دیں ۔ یوں تو یہ سب کچھ مغربی استعمار کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا ۔ تاہم جوں جوں مفتوحہ اوطان و اقوام میں اضافہ ہوتا گیا توں توں یہ حیلے بھی پھیلتے گئے ۔ قدرتی بات ہے کہ محکوم قوموں کے جملہ افراد ایک ہی طرح کے معیار ایمان کے مالک نہیں ہوتے ۔ ایک ہی طرح کی نظر میسر نہیں ہوتی ۔ چنانچہ ایک کثیر تعداد نقالی پر اتر آئی تھی ۔ علاوہ ازیں معاشی مجبوریاں ”کام دکھاتی ہیں“ ۔ ایک شے اور ہے جسے ہوس کہتے ہیں ، ہوس اولاد آدم کی کثرت کثیرہ کو بے راہ رو کر دیتی ہے ۔ معاشی مجبوریاں ظالم شے ہیں ۔ کَادَ الفَقْرُ اَن یکون کفرا ۔ تاہم وہ افراد جن کے عقائد پختہ ہوتے ہیں وہ نان جویں قبول کر لیتے ہیں ۔ اور ایمان بیچ کر خوان نعمت پھیلانے کی استطاعت نہیں خریدتے ۔ مگر بقول علامہ ”انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد“ ۔ جہاں اہل حوصلہ

موجود رہے وہاں اہل ہوس بھی پائے گئے جو غیر ملکی اور غیر مسلم آقاؤں کے گن گاتے رہے ۔ ان کے حضور سر جھکاتے رہے ، اور غلامی و چاکری کے باب میں پائداری دکھانے کا یقین بھی دلاتے رہے ۔ انہی میں وہ لوگ بھی تھے جن کو غلامی کا طوق خان صاحبی اور خان بہادری کے تمغے کی شکل میں ملتا تھا ، وہ تمغہ ہار کی سی پٹی میں لگا ہوتا تھا اور گلے میں ڈال دیا جاتا تھا ۔ یہ طوق گلو غلاموں کی نظر میں سامان آرائش تھا اور افزائش عزت کا سبب تھا ۔ بقول علامہ :

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقہ گردن میں ساز دلبری

اس دور غلامی میں غیر ملکی حاکموں اور افسروں کی نظروں میں قابل اور مستعد کہلانے کا شائق ہر غلام جو سرکاری ملازم تھا اپنی ظاہری شکل و صورت غیر ملکیوں کی سی بناتا تھا تا کہ وہ لوگ اس بیچارے ضمیر کے مارے ،، کو اپنا جانیں ۔ حتی کہ اس ذوق غلامی کے جوش میں وہ اپنوں کا خون بھی بہا دیتا تھا تا کہ غیروں کے ساتھ اپنائیت کا ثبوت بہم پہنچا سکے ۔ بقول عزیز احمد

،،مشرق و مغرب کے اس تنازعے میں سب سے زیادہ نقصان جو اقبال کے نزدیک مشرق کو پہنچا وہ تقلید اور قدروں کی دریوزہ گری ہے ۔ مشرق نے مغرب کے جوش عمل اور تسخیر کائنات کی کوشش میں تو خاص پیروی نہیں کی لیکن پروانے کی طرح مغرب کی جھوٹی جگمگاہٹ کا طواف کرتا رہا[1] ،،

حضرت علامہ نے بڑے استقلال کے ساتھ اور بڑی استقامت

۱ - اقبال نئی تشکیل ، از عزیز احمد ، ناشران کتب خانہ تاج آفس کراچی ، ص ۳۶۴

کے ساتھ اپنی ملت کو یہ خوش خبری دی کہ تم جس فرنگی قوت سے مرعوب ہو کر اس کے اطوار اپنانے کے درپے ہو اس کی تہذیب اور اس کا معاشرہ بڑا سست بنیاد ہے - اس تعمیر میں صورت خرابی پنہاں ہے ' اس لئے کہ جو معاشرہ پاکیزہ سیرت افراد کا مجموعہ نہیں وہ صرف مادی قوت کے بل پر زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا - اس کیفیت کو انہوں نے ''شاخ نازک،، قر دیا تھا اور اس وقت قرار دیا تھا جب وہ ابھی انگلستان میں ز تعلیم تھے یعنی ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء کے مابین - اور یہ غزل جس میں فرنگی تہذیب کی خود اہل فرنگ کے ہاتھوں برباد ہو جانے کی باوثوق خبر دی گئی ہے مارچ ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی تھی - یہ وہ دور تھا جب مغرب کی استعماری قوت و سطوت نصف النہار پر تھی سر آغا خان مرحوم نے اپنے سوانح میں قلمبند کیا ہے کہ والد بزرگوار کے ایک انگریز میجر سے روابط تھے ، وہ میجر ہمارے گھر آیا کرتا تھا - ایک روز باتوں باتوں میں میرے ایک عزیز نے ذکر کیا کہ دنیا میں کیسی کیسی شاندار سلطنتیں ظہور میں آئیں اور آخر زوال سے ہمکنار ہو کر بے نشان ہو گئیں اس ضمن میں روما کی سلطنت کا بھی ذکر آیا اور عثمانی سلطنت کا بھی - پھر اس نے برطانیہ کی سلطنت کی طرف اشارہ کیا کہ بڑی وسیع اور طاقتور ہے وغیرہ - اشارہ اس امر کی جانب تھا کہ دیکھیں کتنا عرصہ قائم رہتی ہے - کچھ اسی قسم کے الفاظ تھے - اس پر وہ انگریز میجر بے مزہ ہو گیا اور بگڑ کر کہا انگریزی راج ہمیشہ رہے گا یہ دائمی قوت کا مالک ہے اور جس طرح تم سوچتے ہو اس طرح سوچنا بھی غداری کے مترادف ہے - مگر آج جب کہ برعظیم پاک و ہند سمیت تقریباً سارے مقبوضات اور سارے نو آبادیاتی منطقے برطانیہ کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں اگر آج وہ میجر زندہ ہوتا تو اس سے پوچھا جاسکتا تھا کہ وہ حکم دوام کہاں گیا ؟

علامہ نے تکرار و تسلسل کے ہاتھ یورپ کی اخلاق بے بضاعتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ یورپ کی شوکت وشان محض عارضی ہے - وہ یورپ سے مرغوب تو کیا ہوتے ، وہ الٹا یورپ کی انسانیت کش اور اخلاق سوز طرز معاشرت پر تلخ الفاظ میں تنقید کرتے رہے ۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
جو ہو نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

یا یہ کہ

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

آرتھر جوزے Arther Jores اپنے مختصر مقالے سائنس اور اخلاقی مسؤلیت (Science and Moral Responsibility) کا اختتام سطور ذیل پر کرتے ہیں :

"خدا پر ایمان نہ ہو تو بنو آدم حتماً اپنے دور کی روح کے حضور گردن ڈال دیتے ہیں اور اپنے بلند ترین نصب العین کی جستجو بھی خالصتاً مادی مرادوں کی صورت میں کرنے لگتے ہیں اس امر کی جدید ترین مثال عصر حاضر کے رنگا رنگ اور فیشنی نظریات ہیں ۔ خدا پر ایمان نہ ہو تو بنو آدم دنیا کو لازماً اذیت و نکبت کی نذر کر دیتے ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ایسے لوگ پائے جاتے رہے ہیں، جنہوں نے تصور الہ کے بغیر زندگی بسر کر دینے کی سعی کی مگر خدا پر ایمان لائے بغیر زندگی بسر کرنا جتنا تباہ کن اور خود کش آج ہے اتنا اس سے قبل کبھی نہ تھا" [1]

---

1. Martin Secker Science & Freedom and Warburg Ltd. London. P. 254

حضرت علامہ دیکھ رہے تھے کہ یورپ کی ترقی اہل یورپ کی اس محنت پر منحصر ہے جو انہوں نے سائنس اور صنعت کے کے ضمن میں صرف کی ہے ۔ لہذا ان کے نزدیک اہل یورپ کے یہاں اگر کوئی شے لائق تقلید تھی تو وہ ان کا ولولہ و شوق اور جزبہ محنت و ترقی تھا ۔ اہل مشرق اور بالخصوص اہل مشرق اسلامی کا فرض ، حضرت علامہ کی نظروں میں یہ تھا کہ وہ جدید علوم وفنون کے مفید پہلوؤں سے بھر پور استفادہ کریں ۔ انہوں نے بر ملا ٹوکا کہ یورپ والوں کی ترقی کا سبب اور غلبے کا باعث ننگے ناچ ، کپڑوں اور بالوں کے نئے نئے فیشن نہیں ۔ یورپ کی ترقی کا راز نہ لادینی میں مضمر تھا اور نہ لاطینی خط پر منحصر تھا ۔ حضرت علامہ کا مقصد یہ تھا کہ آنکھیں کھول کر یورپ کی تہذیب اور سیاسی پیش رفت کا مطالعہ کیا جائے ۔ جو شے غلط ہے اسے رد کر دیا جائے اور جو شے ٹھیک ہے اسے قبول کر لیا جائے ۔ چشم تجزیہ و تحلیل بیدار رہنی چاہئے ،
اشعار ذیل میں یہی وضاحت پیش کی گئی ہے

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دخترانِ بے حجاب
نے ز سحر ساحران لا لہ روست
نے ز عریاں ساق و نے از قطع موست
محکمی او را نہ از لا دینی است
نے فروغش از خط لا طینی است
قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمین آتش چراغش روشن است

مگر علامہ اقبال دیکھ رہے تھے کہ مسلمان بالعموم مرعوبیت کا شکار ہیں اور اس مرعوبیت کا باعث ان کی مغلوبیت ہے ۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ظاہر میں نظرین یورپی تہذیب کے درخشندہ ظواہر

سے بیشتر متاثر ہیں اور مسلمان یورپ کے جدید نظریات کو بلا تنقید اورے چھان پھٹک قبول کئے جا رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ یورپ کے نظریات ان کی مادی زندگی کے مناظر و مظاہر اور مناہج و نتائج پر مبنی تھے ۔ وہ انہی کے عمل کا رد عمل تھے لہذا لازم تھا کہ مسلمان نیک و بد کو پہچانتے ۔ چنانچہ حضرت علامہ نے اپنے خطوں میں اور ملفوظات میں بارہا اس امر پر زور دیا ہے کہ یورپ کے سائنسی علوم ضرور حاصل کئے جائیں مگر یورپ کا فلسفہ اس قابل نہیں کہ اسے منہ لگایا جائے ۔ اور عیاں ہے کہ معاصر نظریات بھی جدید و قدیم یورپی فلسفے کی روایت پر استوار تھے ۔ جدید کی طرح یورپ کا قدیم فلسفہ بھی مادی تھا ۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یورپ کی مشینی زندگی بے درد ، بے ایثار اور غیر انسانی زندگی ہے ۔

بقول علامہ :

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

لیکن حق یہ ہے کہ نیک و بد کو پہچاننے کے لیے کوئی کسوٹی اگر پیش نظر نہ ہو۔ کوئی ایسا معیار نہ ہو جو کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھائے تو فرق کیونکر محسوس ہو ۔ لہذا ضروری تھا کہ مسلمان پہلے اسلامی تعلیمات سے مزین اور مسلح ہوں ۔ ان کے قلوب میں ان کے عقیدے راسخ ہوں اور ان کی روشنی میں اپنے آداب و اخلاق استوار کریں تاکہ مشینوں کی بے مروتی انہیں بے رحم اور بے دین نہ بنا دے چنانچہ حضرت علامہ کہتے ہیں :

کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے میخانے
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوز لا الہ نہیں

ان کے نزدیک یورپی تہذیب اخلاق و انسانیت کے بنیادی تصورات کی دشمن تھی - اپنے انگریزی خطبات میں انہوں نے اس امر پر ان پر زور الفاظ میں اظہار خیال کیا :

"Believe me, Europe today is the greatest hindrance in the way of man's ethical advancement." 1

پھر اہل فرنگ نے جس طرح اپنے اپنے مقبوضہ علاقوں میں اپنا مخصوص طرز تعلیم رائج کیا وہ ظاہر ہے ، انگریزوں نے بھی برعظیم پاک و ہند میں اپنے انداز و اسلوب کے مطابق تعلیمی و تدریسی سلسلے شروع کئے اس تعلیم جدید کے اخلاق دشمن اور دین سوز مزاج کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا - ہندؤں کے کوئی لگے بندھے دینی ، معاشی ، سیاسی ، تعلیمی اصول نہ تھے جو مجروح ہوتے - انہیں تو فطری اور ذہنی افراتفری سے الٹا نجات مل گئی مگر مسلمانوں کا ہر شعبہ زندگی بہر طور ایک مرکزی نظام اخلاق سے مربوط تھا اور اس مرکزی نظام اخلاق کا نقطہ ارتکاز عقیدہ توحید تھا - ان کی ہر تعلیم " بسمہ اللہ الرحمٰن الرحیم"سے شروع ہوتی تھی - مگر انگریزی طرز تعلیم نے مسلمان بچوں کو رفتہ رفتہ اس مرکزی نقطے سے دور ہٹا دیا اور انہیں پریشاں خیالی کی نذر کر دیا وہ اپنے ماضی سے گھٹنے لگے گویا اپنے تاریخی وجود سے دور ہٹنے لگے - وہ جن چیزوں کو محترم جانتے تھے وہ غیر محترم ہوتی گئیں - بقول علامہ اقبال :

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

---

1. Reconstruction. of Religious thought in Islam. P. 188.

۱۰۴۸۷

علامہ اقبال ان معدودے چند اہل نظر اور اہل یقین میں سے تھے جنہوں نے اپنے دین کے دامن کو مظبوطی سے تھامے رکھا اور نئے نظریات کو بنظر غائر دیکھ کر اس لیے رد کر دیا کہ ان میں سے اکثر کی بنیاد مادی تھی اور وہ انکار خدا پر استوار تھے ۔ وہ اللہ کے نام سے شروع کرنے کی اساسی تعلیم کے عدو تھے ۔ پھر یہ کہ خود ان نظریات میں ان کے بطلان کے باعث محکمی کے آثار نہ تھے ۔ وہ آدمیت کے لئے باعث رحمت نہ بن سکتے تھے وہ کسی بھی معاشرتی زندگی اور تہذیب و ثقافت کو زیادہ دیر تک سہارا نہ دے سکتے تھے ۔ حضرت علامہ کہتے ہیں :

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

''ضرب کلیم ،، کی نظم ''جاوید سے،، کا پہلا شعر ہی یہ ہے :

غارت گر دیں ہے یہ زمانہ
ہے اس کی نہاد کافرانہ

چنانچہ اسی بنا پر انہوں نے بصد فخر اظہار کیا کہ وہ یورپی حکمت و فلسفہ سے اور معاشی و معاشرتی آداب سے ہرگز مرعوب نہیں ہوئے اس لیے کہ ان کی نظر میں اسلام کے روشن اساسی اصول بسے ہوئے تھے جو قرآن و سنت پر استوار ہیں ، جو دائمی ہیں اور خیر ہی خیر ہیں چنانچہ انہوں نے اعلان کیا :

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اسی طرح فارسی میں فرمایا :

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست
من از حرم نگزشتم کہ پختہ بنیاد است

یہ رویہ سوچا سمجھا رویہ تھا ۔ محض تقلید آبا کی کورانہ روش نہ تھی ۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مغرب کی تہذیب بناوٹی ہے۔ وہ بدن کی عبادت اور بدن کی سجاوٹ پر مبنی ہے ۔ وہ جبلتوں کی تسکین پر تلی ہے ، وہ جبلتیں جن کو کسی اعلیٰ ضابطے اور شریعت کا پابند نہیں کیا گیا ۔ علامہ کو یقین تھا کہ وحشی جبلتوں کی ''پابندی،، یورپ کے معاشرے کو کھا جائے گی ۔ وہ یہ باتیں اس دور میں کہہ رہے تھے جب یورپی تہذیب کو بہ نظر عموم شرافت و ثقافت کا نقطہ عروج قرار دیا جا رہا تھا اور اس نظر کے مالک وہ اہل علم تھے جن کو یورپی تسلط کی تیز ہواؤں نے ہلا کر رکھ دیا تھا ۔ یہ وہ دور تھا کہ جب سارا مغربی استعمار تو رہا ایک طرف برطانوی مقبوضات پر بھی سورج غروب نہ ہوتا تھا ۔ خدا کا شکر ہے کہ آج طلوع ہی نہیں ہوتا ۔ اس وقت علامہ اقبال کی باتیں اہل ایمان کی نظروں میں پختگی ایمان اور روشنی بصیرت کا نشان تھیں مگر ان لوگوں کے نزدیک جو اندر اور باہر سے صاحب بہادر بن چکے تھے اور بخیال خویش بڑے ہی روشن خیال (Enlightened) تھے ، یہی باتیں بے وقت کی راگنیاں تھیں ، مجذوب کی بڑ تھیں ، عارضہ ماضی پرستی کی علامتیں تھیں ۔ اس دور میں پائے استقلال دکھانا اور اپنے عقیدے پر قائم رہنا اور ایمان کی حقانیت پر بھر پور بھروسا کرنا کار آسان نہ تھا ۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم لکھتے ہیں :

''اقبال ہم میں اس وقت آئے جب ہم اپنی زبوں حالی کی آخری حد تک پہنچ چکے تھے ۔ ہم کو اپنی باتیں اپنے اسلاف اپنی روایات ، اپنی استعداد ، اپنی تہذیب و تمدن اپنا علم و کمال ، اپنا مذہب و اخلاق غرض سب کچھ پست و ہیچ نظر آتا تھا ۔ ہم ان سے شرماتے تھے ۔ ہم اکثر

ان کا مضحکہ اڑانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ پڑھے لکھے اور ترقی یافتہ لوگوں میں بیٹھ کر ہم اپنے علم و کمال، اپنے تمدن اپنے شعر و ادب کی آڑ پکڑنے سے شرماتے تھے۔ اقبال نے اس طلسم کو توڑ دیا،،[۱] خود حضرت علامہ کا بیان ہے:

''غلام قومیں مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور جب ان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتی ہیں جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترقع ہو[۲]،،

واضح ہے کہ یہ فرار، ایمان و ایقان کے غیاب کی علامت ہے، عقیدے کا استحکام جو کبھی عشق و جنوں بھی کہلاتا ہے شخصیت کو نقطہ ارتکاز عطا کر دیتا ہے۔ شخصیت منتشر ہونے کے بجائے متحد ہوجاتی ہے۔ اس کے مادی اور روحانی وجود میں توافق نمودار ہوتا ہے بالفاظ دیگر اس کیفیت کو توحید فردی بھی کہا جا سکتا ہے۔ حضرت علامہ کے بقول

عمل خواہی؟ یقین را پختہ ترکن
یکے جوئے و یکے بین و یکے باش

آدمی کے قول و فعل کی وحدت اسے ایک شخصی کردار سے مایا دار کر دیتی ہے اور اسے حقیقی معنوں میں انفرادیت سے نوازتی ہے یعنی اسے سچ مچ ''فرد،، بنا دیتی ہے۔ پھر وہ جو ایک ہی رنگ، آہنگ، امنگ، اور ترنگ کے مالک ہوں خواہ ان کی عددیت کچھ ہی ہو، وہ کروڑوں ہوں، وہ اربوں ہوں ان میں ''توحید،، جلوہ گر رہتی ہے، وہ دور ہوں خواہ نزدیک۔ جس

---

۱ - اقبال شخصیت اور شاعری، ص ۵

۲ - انوار اقبال، ص ۲۱۷

کسی بھی نسل سے تعلق رکھتے ہوں جونسی بھی زبانیں بولتے ہوں - جونسے بھی منطقوں میں آباد ہوں ان کی کثرت میں وحدت کار فرما ہوتی ہے ، بقول علامہ اقبال :

یک شو و توحید را مشہود کن
غائیش را از عمل موجود کن

اس اشتراک فی العقیدہ سے عمل میں آنے والا معاشرہ اسلام کی نسبت سے امت مسلمہ کہلاتا ہے جو اگر اپنے بنیادی عقائد و اصول پر استوار ہو تو ایک ہی مرکز و محور کے گرد گھومتا ہے - وہ محور دین ہے - اگر ایسا ہو تو زندگی کو معنویت و قوت حاصل ہو جاتی ہے - ورنہ ہر سو بے معنویت اور حقیقت سے دوری کا دور دورہ رہتا ہے - بے ربطی انتشار اور مہمل پن کے شعور کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا - بقول حضرت علامہ :

نقطۂ پر کار حق مرد خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

پھر جس جس شخص کو دولت یقین میسر ہے وہ نظراً فکراً اور عملاً افتراق و انتشار کا شکار ہو ہی نہیں سکتا ، چنانچہ توحید الٰہی اور توحید شخصی کے نور میں ایک رابطہ پیدا ہو جاتا ہے ذرے کو مرکز نور کی منزل نظر آنے لگتی ہے - اس کا رخ متعین ہو جاتا ہے - یہی عالم آدمی کا ہے اگر اس کا نقطہ یقین کوئی نہیں اور وہ نظر گاہ محبت و عقیدت سے محروم ہے تو بے چارہ کہیں کا بھی نہیں ، وہ غریب الوطن ہے - اپنے گھر میں پردیسی ہے- اپنے وجود میں اپنے آپ سے اجنبی ہے - ایک بزرگ کا قول ہے "لیس الغریب من لا زاد لہ ، الغریب من لا مراد لہ" (غریب وہ نہیں جس کے پاس زاد نہ ہو، غریب وہ ہے جس کی کوئی مراد نہ ہو) - یعنی

نا مراد وہ ہے جس کا کوئی محبوب و مقصود نہ ہو ۔ اور یہ بڑا گھاٹے کا سودا ہے کہ زاد لے لیا جائے اور مراد کو چھوڑ دیا جائے ۔ رزق کی خاطر رازق کو بیچ دیا جائے ۔ دنیا سنوارنے کی خاطر دین کو بگاڑ لیا جائے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دین باقی رہتا ہے اور نہ دنیا ساتھ دیتی ہے ۔ ایک عرب شاعر نے کہا تھا

نرقع دنیانا بتمزیق دیننا فلا دیننا یبقی و لا ما نرقع

''ہم دین کا ملبوس چاک کرکے اپنے ملبوس دنیا کی مرمت کرتے ہیں ۔ نتیجہ یہ کہ نہ دنیا باقی رہتی ہے نہ دین،،

یہ نامرادی اور ایمان کی محوریت سے یہ محرومی مسلمانوں کو خراب کرتی ہے ۔ بقول علامہ اقبال :

شبے پیش خدا بگریستم من
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

(ایک روز میں بحضور خدا رو پڑا اور کہا کہ مسلمان خوار و زار کیوں ہیں ۔ جواب میں یہ آواز آئی کہ کیا تو نہیں جانتا کہ اس قوم کے پاس دل تو ہے مگر محبوب کوئی نہیں)

حضرت علامہ جیسا صاحب وجدان اور صاحب راز ہی ان لطائف کو اس حسن و خوبی سے بیان کر سکتا تھا اس لئے کہ ''اتقوافراسة المومن لانہ یری بنور اللہ،، (مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ نور خداوندی کی مدد سے دیکھتا ہے)

عیاں ہے کہ ایسے شخص کو قلب مطمئن میسر ہوتا ہے ، ایسے آدمی کی نظر دراک ہوتی ہے لہذا وہ اپنے دور کی عام روش خیال سے متفق نہیں ہوتا چنانچہ تصادم پیدا ہوتا ہے، یہ تصادم صاحب یقین کے معیار یقین کے مطابق اسے امتحان و آزمائش سے دو چار کرتا

ہے - عام لوگوں سے مختلف فکر و نظر کا مالک یہ شخص جنون زدہ کہلاتا ہے سبب واضح ہے کہ اس کی باتیں جن حقائق پر مبنی ہوتی ہیں وہ عقل محض کے بس کی نہیں ہوتیں - علامہ بھی یہی فریاد عرض کرتے ہیں

میں نے تو کیا پردہ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگہی

المیہ یہ تھا اور تاحال جاری ہے کہ یورپ کی بالادستی نے امت کو سیاسی معنوں ہی میں مغلوب نہ کیا بلکہ ذہنی اور فکری اعتبار سے بھی مسحور اور مقہور کرکے رکھ دیا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر وہ شے جو یورپ سے آئی وہ احترام اور شوق کی نظروں سے دیکھی گئی خواہ وہ قومیت کا تصور تھا ، خواہ وہ سوشلزم تھا یا کوئی اور ازم - مگر علامہ اقبال یورپ والوں کی حکمت اور ان کے فلسفے کو تنقیدی نظر سے دیکھتے تھے اور اکثر امور میں وہ یورپ والوں سے متفق نہ تھے ، ان کے نزدیک مادہ پرستانہ نقطہ نظر آدمی کو خاک نشیں ، دوں مزاج اور سیاہ باطن بنا دیتا ہے - ذہن اور عقل کو تیزی ضرور ملتی ہے - مگر یہ تیزی حقیقت بینی کی اہلیت سے محروم رہتی ہے ،
علامہ کہتے ہیں :

برا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی ، خرد کی معموری

وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن
پرکار و فسوں ساز ہے نم ناک نہیں ہے

اللہ نے حضرت علامہ کو با بصر بھی بنایا تھا اور با بصیرت بھی - ان کی نظر میں خیر وشر اور صفا و کدر کو پہچاننے کی اہلیت تھی اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی - وہ ہر بات میں دل کی تصدیق کے طالب رہنے لگے اور آخر یقین کی دولت سے

ایسے سیراب ہوئے کہ انہیں یورپ کی تعمیر میں خرابی کے واضح آثار اور عناصر جلوہ گر دکھائی دینے لگے

خبر ملی ہے خدایان بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگزر سیل بے پناہ میں ہے

لیکن ایسے نتائج تک ہر آنکھ تو نہیں پہنچتی ہر دانش کو تو یہ ادراک حاصل نہیں ہوتا چنانچہ وہ جانتے تھے کہ ایک عام تام جوان خام ، یورپی افکار کا آسانی سے شکار اس لئے ہو جاتا ہے کہ اپنے عقائد اور اس کے عطا کردہ نظریات کی کسوٹی سے محروم ہوتا ہے ، ایسے عالم میں اس کا پریشان فکر ہونا اور اکثر اوقات بے راہ ہو جانا قرین قیاس ہی نہیں بلکہ اغلب ہے ، علامہ اس صورت حال کو سمجھتے تھے - جبھی تو کہا تھا :

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مرد قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہگزر سے
الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلوب ہے صدف سے کہ گہر سے
پیدا ہے فقط حلقہ ارباب جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
جس معنی پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

محض خوبصورت پیچیدار لفظی تراکیب اور اصطلاحی کلمات کی فراوانی سے کچھ ہاتھ نہیں آتا - صاحب نظر یہ دیکھتا ہے کہ لب دانش سے جو کچھ ارشاد ہو رہا ہے اس میں معنی مفید بھی ہے

یا نہیں مگر ظاہر ہے کہ بخیال اقبال معنی مفید تک رسائی کسی ایسی ہی عقل کے لیے ممکن ہے جو پرورده جنوں ہو - اور اس سے ہر گز یہ مطلب اخذ نہیں کرنا چاہئیے کہ حضرت علامہ یورپ کے سر تا سر مخالف تھے یا یہ کہ آنہیں وہاں کی کوئی شے اچھی نہ لگتی تھی - معاملہ یہ نہیں ، انہیں یورپ کے جدید سائنسی علوم کے ضمن میں اہل یورپ کے ساتھ بڑی حد تک ہمدردی تھی اور وہ ان کی محنت و کاوش کی داد دیتے تھے - علوم اپنی ذات میں نہ شرقی ہیں نہ غربی ، اور اس امر پر قبل ازیں روشنی ڈالی جا چکی ہے - انہوں نے مغربی علوم کے مفید شعبوں سے بھر پور فائدہ آٹھانے کی تلقین کی ہے مگر جس بات پر انہوں نے زور دیا وہ یہ تھی کہ جو کچھ دیکھو اپنی آنکھ سے دیکھو :

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں تیرے نور سحر سے

اگر ایمان و یقین کا مظبوط ناقد موجود نہ ہو تو گویا خیر و شر میں امتیاز کا جوہر دب جاتا ہے - یہی یورپی تعلیمات کے ضمن میں بھی ہوا - سائنسی اور دیگر تعمیری علوم کے دامن میں یورپ کے ملحدانہ خیالات بھی ساتھ ہی ساتھ تشریف لاتے رہے - ایک طرف علمی ترقی کا غرور اور دوسری طرف دینوی ٹھاٹھ کی گنجائش ، جس کے باعث عقیدے میں تزلزل وارد ہونے کا ہر لحظہ اندیشہ - بانگ درا کے تیسرے حصے میں علامہ اقبال نے جدید تعلیم پر کئی ایسی نظمیں لکھی ہیں جو ضرب کلیم کے حصہ تعلیم و تربیت کی پیش رو ہیں - ان نظموں میں آنہوں نے بہ تصریح اسی خدشے کی نشاندہی کی ہے ، وہ شاعر رنگین نوا تھے لہذا اپنے آپ کو دیدہ بینائے قوم جانتے تھے - چنانچہ وہ نظم بعنوان ''تعلیم اور اس کے نتائج '' میں لکھتے ہیں :

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشہ فرہاد بھی ساتھ
"تخم دیگر بکف آریم و بکاریم زنو
آنچہ کشتیم زحجلت نتواں کرد درو"

ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی پہلے نقل کر چکے ہیں کہ "اتقوا فراسۃ المومن لأنہ یری بنور اللہ مومن کی فراست سے ڈرو (اور متنبہ رہو) اس لئے کہ وہ نور خداوندی کی روشنی میں دیکھتا ہے"۔

مختصر یہ کہ حضرت علامہ کی مومنانہ بصیرت اس نور کی روشنی میں کار فرما تھی جو اللہ نے انہیں ان کے خلوص خاطر کی باعث عطا کر رکھی تھی ۔ وہ موتیوں اور جھوٹے نگوں میں تمیز کرنا جانتے تھے وہ مادی قوت اور مادی لذت ، بالفاظ دیگر تن پرستی و بندگی ہوس کے انجام کو جانتے تھے کہ جیسا محبوب ویسا محب ، جیسا معبود ویسا عابد ، روح کی تپش سے محروم معاشرہ اور مشینی دیوتاؤں کے حضور سر جھکانے والا معاشرہ اپنے اندر مشینی بے دردی پیدا کر کے لازماً دشمن انسانیت کردار ادا کرے گا ۔ مشینوں کی حکومت ہو تو دلوں میں ایثار ، ہمدردی اور مروت کہاں پیدا ہو سکتی ہے اور اگر یہ نہیں تو مشینی معاشرے کا انسان ، انسان کیونکر کہلا سکتا ہے حضرت علامہ کی نگاہوں پر ایسے بے درد معاشرے کا مآل بھی عیاں تھا ۔ کسی حکیم نے کہا تھا کہ تم لکڑی کو پوجو گے تو لکڑی بن جاؤ گے ، پتھر کو پوجو گے تو پتھر بن جاؤ گے یعنی جس سے عقیدت رکھو گے اس کے اوصاف اپنے اندر بھر لوگے

پھر اس سے عقیدت کیوں نہیں رکھتے اور اسی کو کیوں نہیں پوجتے جو سب سے بلند ہے اور اسی کے اسماء اسماء حسنیٰ ہیں اور وہ اسماء اس کے صفات جلال و جمال کے مختلف پہلوؤں کے آئینہ دار ہیں ۔ اسی کا رنگ اختیار کرو ۔ بقول علامہ :

رنگ او برکن مثال او شوی
در جہاں عکس جمال او شوی

اللہ نور السموات والارض ۔ گویا صبغت اللہ (اللہ کا رنگ) اختیار کرنے والا بھی نور ہی کا مظہر ہوتا ہے جس قدر صبغت اللہ زیادہ ، اسی قدر نور زیادہ ، بصیرت زیادہ ، دانش زیادہ ، فہم و شعور زیادہ ۔ پھر عالم نورانی کیوں دکھائی نہ دے پھر یہ امر بھی واضح ہے کہ خدائی صفات کا انسانی پر تو کامل بلکہ اکمل تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وصلم ہی کی ذات ہے چنانچہ نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ اختیار کئے بغیر اخلاق الہیہ کا اسلوب اپنایا نہیں جا سکتا ۔ چنانچہ نوری بصیرت سے فیض یاب رہنے کی خاطر حضرت علامہ بحضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وصلم التماس کرتے ہیں کہ میری دانش ، میرا شعور ، میری حکمت ، میرا عرفان ، میرا فکر ، میرا جذب ، شوق اور میری نظر میرا سہارا اور میری قوت میرا ہر وصف جو بھی ہے اور جس قدر ہے آپ ہی کی بدولت ہے حضور ہی سے نسبت کے باعث ہے ۔

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

اور پھر بڑے درد کے ساتھ کہتے ہیں کہ میرا واسطہ ان لوگوں سے ہے جو باطل پرست ہیں - جو نور ایمانی کے دشمن ہیں- جو روشن قدروں کے عدو ہیں - مجھے ہمت عطا کیجئیے اور میرے چراغ ایمان کو مزید روغن سے نوازئیے تاکہ میں ان گماشتگان ظلمت کا مزید پائداری کے ساتھ مقابلہ کر سکوں -

با پرستاران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

قرآن حکیم کی تعلیمی جہت اور علامہ اقبال

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سورہ ۲۴ ، آیت ۳۵)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے ، اور اللہ وہی ہے جس نے "لاشے" سے ہر شے پیدا کر دی ، "بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرض" (سورہ ۲ ، آیت ۱۱۷) جہاں کچھ نہ تھا وہاں سب کچھ ہوگیا اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ "یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ" (سورہ ۳۵ ، آیت ۱) وہ (خدا) خلق میں جس چیز کا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے ۔ اولاً جو کچھ تھا وہ نور ہی نور تھا ۔ پھر جو بنا نور ہی سے بنا ۔ نور ہی منجمد ہوا ، نور ہی نے دبازت اور کثافت اختیار کی ، نور ہی نے ٹھوس وجود پایا ۔ ٹھوس ہونے کا آغاز دھواں تھا ، سائنس نے اس کیفیت کو لطیف اجزا پر مشتمل گیسوں کا مظہر (Gaseous Mass with Fine Particles) [1] بتایا ہے اور قرآن اسے "دخان" قرار دیتا ہے ۔

اشیاء تحلیل ہوں تو آخر کار دھواں رہ جائے ، اور دھواں لطیف ہو کر پھر نور (Light) میں ڈھل جائے ۔ جبھی تو علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر آدم سچ مچ دیکھنے والی آنکھ کا مالک ہو تو آنکھ کے سامنے کوئی شے حائل نہیں رہتی ، شرط یہ ہے کہ کوئی دیکھے :

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسمہائے پنہانی

---

1. The Bible, The Quran and Science, By Mauric Bucaille (English) Indianapolis, I. N., USA, P. 139

اسی کیفیت کو علامہ اقبال نے ایک اور مقام پر ان الفاظ میں واضح کیا ہے :

ہر چہ می بینی ز انوار حق است !
حکمت اشیا ز اسرار حق است !

یعنی اشیاء کی حقیقت اسرار الٰہی سے آگہی ہے اور سب اسرار سراسر انوار ہیں ۔ اسی لیے تو کہا گیا ''العلم نور'' ۔ آدم کو اللہ نے وہ نوری اہلیت عطا کی ہے کہ وہ کائنات کے اسرار سے آگاہ ہو سکے ۔ قرآن نے کئی بار واضح کیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کے حضور میں جب فرشتوں کو سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تو فرشتوں نے اس حکم پر حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا کہ اے مولا! ہم جو تیری عبادت اور تقدیس میں مصروف رہنے والی مخلوق موجود میں پھر آدم کو خلق کرنے کا مطلب ؟ اور آدم وہ مخلوق ہے جو (اپنے خمیر کے باعث) جہاں میں افراتفری ڈالے گا ، خون خرابہ کرے گا ، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد کیا : میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ، اور پھر فیصلہ ''علمِ اشیاء'' سے آگاہی پر ہوا ۔ یہ آگاہی فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارزانی نہیں ہوئی تھی ۔ آدم کو اللہ نے اس علم سے سرمایا دار کر رکھا تھا ، مراد ہے آدم کے خمیر میں وہ جوہر اور وہ قابلیت اللہ نے شامل کر دی تھی جو اشیاء کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکے ، یہی آدم کی فضیلت تھی ، اسی فضیلت کے حضور میں فرشتوں کو سر ادب خم کرنا پڑا ، جبھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے :

''اَللّٰھُمَّ اَرِنِی حَقِیقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ''

(اے اللہ مجھے حقیقت اشیاء اس طرح دکھا دے جس طرح کہ واقعی ہے) ۔

اور ظاہر ہے کہ دعا اللہ کے انوار کو سر تا سر بے پردہ دیکھتے رہنے کی آرزوئے بیتاب ہے ۔ قران کریم کی پہلی آیت جو حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ (سورہ ٩٦ ، آیت ١) "، (اے رسول ! آپ پڑھیں اس رب کے نام سے جو خالق ہے) ۔

وہ خالق جو رب بھی ہے ، وہ جو خلق کرنے کے بعد پالتا بھی ہے ، تحفظ بھی کرتا ہے ، اور وہ جو نہایت بلند ہے ۔ یعنی اس کتاب کو جو اسرار الٰہی کا خزینہ اور قدیم و جدید علوم کا امانت خانہ ہے ، اللہ کے نام سے پڑھنے کا حکم ہوا ۔ یہیں سے قرآنی تعلیم کی جہت طے ہو جاتی ہے، یعنی علم کے جس بھی درجے ، جس بھی شعبے اور جس بھی حصے کو شروع کیا جائے اور جہاں سے بھی شروع کیا جائے اللہ ہی کے نام سے شروع کیا جائے ، اس لیے کہ وہی خالق ہے لہذا اسی کا علم کامل ترین "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ "، (سورہ ٦٧ ، آیت ١٤) (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟) ۔ اللہ کے نام سے آغاز کرنے کا مطلب ہوا اللہ کی مطلق خلاقی کا اقرار و اعتراف ہی سر چشمہ مخلوقات ہے ، روح کائنات ہے اس کے حوالے سے مطالعہ اشیاء کریں تو کائنات ایک بامعنی وحدت نظر آئے گا ، ہر ذرہ دوسرے سے مربوط نظر آئے گا جس کا ایک مطلب یہ بھی ہوگا کہ آدم کو ہر لحظہ یہ احساس رہے گا کہ وہ خود بھی ایک حقیقت ہے اور حقیقۃ الحقائق کے ساتھ وابستہ و مربوط بھی ہے ۔ اگر یہ ربط نہ رہے تو آدم ایک مہمل وجود ہو کر رہ جائے ۔ حضرت غوث الاعظمؒ فرماتے ہیں :

"کُلُّ مَنْ لَا یَعْبُدُ اللہَ عَزَّ وَ جَلَّ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَدْرُوْنَ لِمَ خُلِقُوْا "،

(ہر وہ شخص جو خدا کی عبودیت کا دم نہ بھرے وہ ان میں سے ہے جن کو معلوم نہیں کہ وہ کیوں پیدا کئے گئے) پروفیسر ایم عمرالدین

١- الفتح الربانی ، المصطفیٰ البابی ، مصر ، ١٩٦٨ ، ص ٦١٥

نے امام غزالیؒ کے فلسفۂ اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :

Knowledge of God includes the knowledge of the Creator and the creation comprising the universe, the soul, the circumstances attending after death and so on. And knowledge of these things constitutes the knowledge of Islam. Thus it is all comprehending, for every science is a religious science, if it promotes the realization of perfection. No science is bad in itself because every science is simply knowledge of the facts as they are, and this cannot be bad in itself. 1

مراد ہے ہر علم کا حصول دین کا حصہ تھا ، اور یہ علم حیات ہی کے ہر شعبے سے متعلق نہ تھا حیات بعد الموت سے بھی مربوط تھا - چنانچہ علم حاصل کرنا اور علم کو عام کرنا ثواب اور سربسر عبادت ہے - یہی باعث ہے کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان دوسروں کو پڑھانا لکھانا اپنے لیے باعث رحمت جانتا تھا ، وہ گھر میں بھی معلم ہوتا تھا اور باہر بھی - نور کا اکتساب اور نور کی تقسیم ، کار خیر میں امداد باہمی ہے چنانچہ معلم کا مقام مسلم معاشرے میں بہت وقیع تھا - پہلی بار باتنخواہ اساتذہ بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی میں مقرر کئے گئے - یہ یونیورسٹی پانچویں صدی ہجری میں نظام الملک طوسی نے قائم کی تھی - باتنخواہ اساتذہ کا تقرر مسلمان اہل علم کو سخت ناگوار گذرا ، ڈاکٹر محمد اسد طلس لکھتے ہیں کہ جب ہمہ وقتی تنخواہ دار اساتذہ ملازم ہوئے تو علمائے خراسان نے ماتم علم کی مجلسیں منعقد کیں اور کہا کہ :

''معالی بلند نظر اور پاک نفس لوگوں کا شیوہ تھا جن کے پیش نظر علم کے ذریعے فضیلت و کمال کا حصول ہوتا تھا ، مگر اب جو علماء آئیں گے وہ علم کو محض کمائی کا ذریعہ بنائیں گے اور تنخواہ کے خیال سے ُدوں نہاد اور نکمے افراد بھی اس جانب کا رخ کرنے لگیں گے ،، ۲

The Ethical Philosophy of Gazali, Sh. M. Ashraf, Lahore(1977) 1. P. 113

۲ - التربیہ والتعلیم فی الاسلام ، بیروت - ص ۱۲۶

با تنخواہ اساتذہ کی تقرری حالات کی مجبوری تھی ، علوم پھیلتے جا رہے تھے ، تعلیم میں ضبط و نظام پیدا کرنے کی خاطر نظام الملک کو یہ اجتہاد کرنا پڑا ۔ ہم اہل علم کے نزدیک تعلیم و تعلم کا جو تقدس تھا وہ ان کے ماتمی رد عمل سے واضح ہو جاتا ہے ۔

علامہ اقبال کے نزدیک ماخذ از روئے قرآن تین ہیں ، مطالعہ کائنات ، مطالعہ تاریخ (یعنی آثار ماضی) اور مطالعہ نفس انسانی [1] کائنات کے مطالعہ اور اس سے آگہی ہی کے مفہوم میں تسخیر کے معانی پوشیدہ ہیں ۔ قرآن کا ارشاد ہے :

"اَلَم تَرَوا اَنَّ اللّٰہ سَخَّرَ لَکُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الاَرضِ"
(سورہ ۳۱ ، آیت ۲۰)

(کیا تم لوگوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے) ۔

مارس بکیل (Maurice Bucaille) لکھتا ہے کہ اگر یہ کتاب (مصنفہ ۱۹۷۷ء) میں نے تیس برس پہلے لکھی ہوتی تو میں قرآن کی آیات تسخیر کو کسی اور طرح دیکھتا ، انہیں محض پیشگوئیاں سمجھتا ، مگر اب تو دیگر سیاروں پر میزائل پھینکے جا رہے ہیں ۔ انسان خلائی سفر کر رہے ہیں ۔ آج وہ آیات تسخیر ایک مسلم حقیقت ہیں اور یہ وعدہ پورا ہو رہا ہے ۔ اگر ہر آگہی اللہ کے حوالے سے حاصل کی جائے تو پوری کائنات کا ربط باہمی زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ اگر خلاق العلیم پر ایمان ہو تو کائنات ایک وحدت ہے۔ ایک زندہ وجود نامی ہے ، سائنس داں اپنی تحقیقات کی بنا پر اقرار کرتے ہیں کہ ساری کائنات باہم مربوط ہے مگر اہل ایمان سائنس دان جو کائنات کے ربط باہم کے سبب اور مصدر سے آگاہ ہیں ان کا کیف و سرور کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے ۔ علامہ اقبال نے خوب کہا ہے :

۱۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ترجمہ از سید نذیر نیازی ، ص ۱۴۶

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو !
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

قرآن نے آغاز اشیا کی حقیقت بتا دی تھی کہ دخان اور گیس سے شروع ہوئیں سائنس آج ثابت کر رہی ہے - قرآن نے بتا دیا تھا کہ ہر ذی حس شے از نبات تا انسان (بشمول حیوان) ہمہ نوع پانی سے پیدا ہوئی ، سائنس آج وضاحت کر رہی ہے - قرآن نے بتا دیا تھا کہ ہر ذی حس کے جوڑے پیدا کیے گئے حتیٰ کہ نباتات کے بھی ، سائنس نے آج اس حقیقت کو ثابت کیا - قرآن نے بتا دیا تھا کہ تمام سیارگان اپنے اپنے مدار میں اللہ کے حکم سے گردش کرتے ہیں ، اپنے حلقے سے کوئی سیارہ بھی باہر نہیں نکل سکتا ، حتیٰ کہ سورج بھی اپنے کسی مستقر کی طرف روانہ ہے ، جدید سائنس نے تصدیق کی - ہاں سورج کے باب میں اڑی رہی ، سائنس کا اصرار رہا کہ سورج گردش نہیں کر رہا مگر ۱۹۱۷ء میں شیپلے (Shapeley) نے ثابت کیا کہ کہکشاں اور سورج کو اپنا سفر مدار مکمل کرنے میں دو سو پچاس ملین سال لگتے ہیں اور سورج تخمیناً ایک سو پچاس میل فی سیکنڈ کے حساب سے رواں رہتا ہے- مگر قرآن نے چودہ سو سال قبل واضح الفاظ میں یہ حقیقت بیان کر دی تھی - [1] قرآن نے بیان کر رکھا ہے کہ اس کائنات میں اس دنیا جیسی اور بھی دنیائیں ہیں - مارس بکیل لکھتا ہے کہ ابھی سائنس اس حقیقت تک رسائی نہیں حاصل کر سکی مگر آج بہت سے سائنس داں اس امکان کے قائل ہیں - بہر حال میں نے ضروری جانا کہ اپنی کتاب میں قرآن کی بیان کردہ اس صداقت کو درج کر دوں جسے سائنس کبھی ثابت کر لے گی - [2]

مطلب یہ کہ سائنس آج قرآن کے حقائق مصرحہ تک پہنچ رہی ہے یا پہنچنے کی کوشش میں ہے - وہ حقائق جو آج سے چودہ سو سال

---

1. The Bible, The Qur'an and Science, P. 161
۲- ایضاً

قبل نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب مبارک میں مندرج ہیں اور جو اس امر کا ثبوت ہیں کہ یہ کتاب انسانی تصنیف نہیں - ذیل میں مارس بکیل کا ایک اقتباس جو قرآنی صداقت اور انجیل کے محرف ہونے پر دلالت کرتا ہے اصل انگریزی میں درج کیا جاتا ہے - وہ لکھتا ہے :

> What initially strikes the reader confronted for the first time with a text of this kind is the sheer abundance of subjects discussed: the creation, astronomy, the explanation of the certain matters concerning the earth, and the animal and vegetable kingdoms, human reproduction, whereas monumental errors are to be found in the Bible, I could not find a single error in the Quran. I had to stop and ask myself: if a man was the author of the Quran, how could he have written facts in the Seventh Century A. D. that today are shown to be in keeping with modern scientific knowledge. 1

محلولہ بالا کتاب کے مصنف نے انجیل کے محرف ہونے کا اقرار کیا ہے - اس امر میں بھی قرآنی صراحت کی تصدیق کی ہے اور ثبوت اس امر کا یہی ہے کہ اگر انجیل میں تحریف نہ کی گئی ہوتی تو وہ سائنسی مسلمہ حقائق کے مخالف نہ ہوتی ، جو خدا قرآن میں صداقتیں بیان کرتا ہے اس نے انجیل میں بھی صداقتیں ہی ارشاد کی تھیں - قرآن کی سچائیاں دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ انجیل کے ساتھ انسانی ہاتھوں نے چھیڑ چھاڑ کی ہے - ہاں مارس بکیل نے کئی ایک مقامات پر اس امر پر زور دیا ہے کہ جہاں سائنس کی روشنی میں کوئی قرآنی آیت آج واضح نہیں اس کا مطلب ہے کہ ابھی سائنس وہاں تک نہیں پہنچی -

حق یہ ہے کہ آج اس سائنس کی روشنی کے دور ہی میں آیات ''متشابہات،، کا معنی عیاں ہوتا ہے - وہ آیات جن کا معنی تا حال شرمندہ وضاحت و صراحت نہیں ہوا ، مفسرین سلف کلمات متشابہات

---

1. The Bible, the Quran and Science. P 120

کا مفہوم بھی شاید بخوبی سمجھنے پر قادر نہ تھے - بہر حال قرآن کو تا آخر الزمان ، انسان کا ساتھ دینا اور علمی و فکری رہبری کا حق ادا کرنا ہے - اس لیے علامہ اقبال زور دیتے ہیں کہ قرآنی تلقین کے مطابق حقائق فطرت پر نظر غائر ڈالی جائے -

"قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس و قمر ، یہ سایوں کا امتداد ، یہ اختلاف لیل و نہار ، یہ رنگ اور زبان کا فرق اور یہ قوموں کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی ، دنوں کی آمد و شد ، حاصل کلام یہ کہ یہ سارا عالم فطرت جیساکہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و تفکر سے کام لے، یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے ، کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا" [1]

یہاں ایک بات ضمناً عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر وحی اپنے دور کی علمی اور فکری ترقی سے بہت برتر ہوتی ہے ، یہ وحی کا اعجاز ہے - اعجاز کا لفظی معنی ہے عاجز کر دینا ، اور وحی کا چیلنج اور اسی طرح معجزے کا چیلنج متعلقہ علم و فکر یا کمال کے ماہرین کے لیے ہوتا ہے ، مثلاً حضرت عیسیٰؑ کا یہ اعجاز کہ وہ کوڑھیوں کو ہاتھ لگائیں اور وہ صحت یاب ہو جائیں یا وہ اندھوں کی آنکھوں پر ہاتھ پھیریں اور وہ بینا ہو جائیں یا وہ قبر پر کھڑے ہو کر کہیں "قُم باذنِ اللہ" : اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑے ہو - یہ بات عوام کے قائل کرنے کی نہیں ، عوام سحر اور اعجاز میں

---

1. تشکیل جدید ، الٰہیات اسلامیہ ، ترجمہ از نذیر نیازی ، بزم اقبال ۱۹۵۸ء ص ۱۹۳

فرق نہیں کر سکتے ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو ان کے معاصر اہل علم اور خصوصاً اہل طب ہی سمجھ سکتے تھے، وہی جانتے تھے کہ علم طب کہاں ختم ہوتا ہے اور معجزہ کہاں سے شروع ہوتا ہے ۔ چنانچہ اہل فکر و نظر کا ایمان سوچا سمجھا ایمان ہوتا ہے اور پھر ان کی مثال عوام پر اثر انداز ہوتی ہے ورنہ عوام از خود مداری ، ساحر اور صاحب اعجاز میں تفریق روا نہیں رکھ سکتے ۔ ہو سکتا ہے انھیں مداری کا مداری پن ، کرامت معجزہ سے زیادہ متاثر کر لے ۔

قرآن کریم نے اس باب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مابین رونما ہونے والے مقابلے کا ذکر کر کے مسئلے کو بڑی اچھی طرح واضح کر دیا ہے ۔ فرعون کا دربار اہل علم اور عوام کے نمائندوں سے بھرا ہوا تھا ۔ جادو گروں نے اپنے کمال سحر کا مظاہرہ کیا ۔ جواباً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا اعجاز دکھایا ، جادوگروں کی رسیوں کو جو سانپ بن کر دوڑنے لگی تھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے اژدھا بن کر ہڑپ کر لیا ۔ فرعون ، اس کے جملہ اکابر دربار اور دیگر حاضرین سب یہ منظر دیکھ رہے تھے ، مگر جادوگر سجدے میں گر پڑے ، اور وہ اس لیے سجدے میں گر پڑے کہ وہی تو فن سحر میں ماہر تھے اور انہی کو تو یہ معلوم تھا کہ سحر کی آخری حد کیا ہے اور اعجاز کہاں سے شروع ہوتا ہے ۔ یہ بات فرعون نہیں سمجھ سکتا تھا ۔ یہ بات فرعون کے اکابر سلطنت یا مندروں کے پروہت نہیں جان سکتے تھے ۔ نیز یہ بات عام رعیت کے افراد کے فہم سے بھی بالا تھی ۔ ساحروں نے اس اعجاز کو تسلیم کیا مگر فرعون اور اس کے اکابر کے نزدیک اور اسی طرح دوسرے عام افراد کے نزدیک بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ برتر کاروبار ساحری تھا اور بس ۔ چنانچہ فرعون نے اپنے ماہرین جادو

سے یہی کہا ''کیا تم ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں ، میں تمھیں یہ اور یہ سزا دوں گا ، جادو گروں کا جواب تھا کہ ہم نے اللہ کی واضح نشانیاں پا لی ہیں'' ۔

''قَالُو لَن نُّوثِرَکَ عَلیٰ مَا جَاءَنَا مِنَ البَیِّنَاتِ وَالَّذِی فَطَرَنَا فَاقضِ مَا اَنتَ قَاضٍ'' (سورہ ۲۰ ، آیت ۷۲)

(جادو گر بولے ہم تجھ کو کبھی نہ ترجیح دیں گے ان شواہد کے مقابلے میں جو ہم کو مل چکے ہیں اور اس ہستی کے مقابلے میں جس نے ہمیں پیدا کیا ، لہذا جو فیصلہ تجھے کرنا ہے کر ڈال)

رہا قرآن کریم تو اس کا اعجاز ایک نہیں ۔ ہمیں معلوم نہیں کیا کیا اعجاز اس کے دامن میں مستور ہیں ۔ قرآن نہ ایک دور کے لیے ہے ، نہ ایک علاقے یا قوم کے لیے ، نہ ایک قسم کے ماہرین کو چیلینج نہ ایک قسم کے علم کو ، تا قیامت اسے ہر کمال سے برتر رہ کر رہبری کرنا ہے ۔ جب یہ نازل ہوا تو اہل عرب کو اپنی زبان فصاحت ترجمان پر بڑا ناز تھا ۔ مسیحیوں کو اپنے علم و بصیرت پر ناز تھا ، یہود کو اپنے عقائد اور صحائف پر گھمنڈ تھا ، مگر قرآن کے سامنے نہ فصحا کی فصاحت ٹھہری اور نہ اہل دلیل کی دلیل نے کام دیا ۔ اہل فصاحت نے مانا کہ کوئی شے ہے جو ان کے بس کی نہیں ، اہل دلیل نے دیکھا کہ قرآنی برہان کے آگے ان کی پیش نہیں چلتی ۔ پھر جن کو اللہ نے خلوص کی دولت سے نوازا تھا وہ اللہ کی برہان کو مانتے چلے گئے ۔ عباسیوں کے عہد میں یونانی فلسفے نے مسلمانوں کی نظروں کو چندھیا دیا اور انھوں نے قرآن کی روح سے غافل ہو کر یونانی فلاسفہ کے دلائل کو قرآن پر منطبق کرنا شروع کیا۔ بڑی دیر کے بعد جا کر

ہوش آیا کہ یونانیت کیا شے ہے اور قرآن کا درس کیا شے ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں :

''شروع شروع میں تو انہیں (مسلمانوں کو) اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ قرآن کی روح فلسفہ یونان کے منافی ہے اور اس حکمت یونان پر اعتقاد کرتے ہوئے انھوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا ، لیکن قرآن مجید کا زور چونکہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے اور حکمت یونان کا حقائق کے بجائے نظریات پر ، لہذا ظاہر ہے کہ یہ کوشیش ایک نہ ایک دن ضرور ناکام رہتیں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ، اور یہ اسی کوشش کی ناکامی تھی جس کے بعد اسلامی تہذیب و ثقافت کی حقیقی روح برسر کار آئی ۔ حتی کہ تہذیب جدید کے بعض اہم پہلوؤں کو دیکھیئے تو ان کا ظہور بھی اسی (یونان کے خلاف مسلمانوں کی ذہنی بغاوت) کا مرہون منت ہے'' [1]

یونانیت کے اس ریلے کے بعد کئی ریلے آئے ۔ آج کے دور میں کہ اس دور کی روح شدید مادہ پرستانہ ہے ، مادہ پرستی کی تلقین کرنے والے یا مادہ پرستی کے رد عمل میں تفریط کا شکار ہو جانے والے ازم کار فرما ہیں ۔ ہر نظام اور ہر ازم کے مقابل علامہ اقبال کے نزدیک تعلیم و تلقین وہی پائدار ہے جو اسلام کہلاتی ہے اور جس کے مبادیات قرآن میں ہیں ، جس کے عملی نمونے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت اور ارشادات میں جلوہ گر ہیں :

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست
من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

اسلام کی تمام تر تعلیمات کی روح یہ ہے کہ آدم اپنے اس مقام کو پالے جسے خدا نے اپنی خلافت قرار دیا تھا ، قرآن ہر دور میں

۱۔ تشکیل جدید ، ص ۱۷۹

آدم کی تربیت اور رہنمائی کا ذمہ دار ہے اور ماہر علم کے لیے مستقل چیلنج ۔ یہ دور سائنسی معجزات کا دور ہے اور ہم سطور سابقہ میں بحث کر آئے ہیں کہ سائنس قرآن کے اعجاز تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے اور کرتی رہے گی ، مگر جیسا کہ پہلے عرض ہوا یہ چیلنج آج کے ماہرین علوم کے لیے ہے ، جو لوگ سائنس کا گہرا مطالعہ کر رہے ہیں اور کارخانہ فطرت کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں آج قرآن کے نزدیک وہی علماء ہیں اور قرآن کا معجزہ انھی کو متاثر بھی کرے گا ۔ اس دور میں قرآن کریم کے انوار کو روایتی تفاسیراس شان سے بیان نہیں کر سکتیں جس شان سے جدید ترین انوار کائنات کو منکشف کرنے والے یا ان انکشافات کی تاریخ کا تازہ و شاداب علم رکھنے والے کر سکتے ہیں ۔ اس دور میں سائنسدانوں کو قرآن پڑھانا چاہیے اور یہی لازمی جہت علمی ہے جو آدم کا زمان معاصر میں اپنے خالق سے رابطہ استوار رکھے اور اس کے اندر ''نفخت فیہ من روحی'' کی شان کا پرتو پیدا کرے ۔

کارخانہ فطرت کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ بنو آدم کو حکم ہے کہ وہ انسان کے ماضی سے آگاہ رہے تاکہ اپنا حال اور استقبال سنوار سکیں ، چنانچہ ایک سے زیادہ بار ''سیروا فی الارض'' کا حکم ہوا ۔ اے بنو آدم دنیا میں گھومو پھرو ، اور دیکھو کہ جو قومیں تم سے قبل یہاں آباد تھیں ان کا انجام کیا ہوا ؟ قرآن نے بتایا ہے کہ ان قوموں کو خدا نے بڑی قوت دی تھی ، بڑی فارغ البالی اور خوش حالی عطا کی تھی ، ہر نعمت سے نوازا تھا ، مگر وہ لوگ غافل ہو گئے ، ہوس نے اندھا کر دیا ۔ لہذا انسانی بلندیوں سے اتر کر حیوانی سطح پر پہنچ گئے ، نیکی اور بدی کے مابین اپنے غرو گناہ اور سرور ہوس کے باعث تمیز کرنے کے قابل نہ رہے ۔ اللہ کے حکم کی کھلے بندوں مخالفت کی لہذا قانون الٰہی سے ٹکرا رگئے ۔ قانون الٰہی توازن بحال رکھتا ہے ، جہاں ذرا توازن بگڑا

اللہ کا قانون آڑے آ گیا ، قرآن کریم نے اچھائی اور برائی کی مثالیں دے دے کر بنو آدم کو عبرت اندوزی پر آمادہ کیا ، آثار ماضی صحیفۂ زمین پر نقوش عبرت ہیں ، تاریخ انسانی کمال و زوال کی داستان ہے ، قرآن کا ارشاد ہے :

''اَفَلَم یَسِیرُوا فِی الْاَرضِ فَتَکُونَ لَھُم قُلُوبٌ یَعقِلُونَ بِھَا و آذانٌ یَسمَعُونَ بِھَا فَاِنّھَا لَاتَعمَی الاَبصَارُ وَلٰکِن تَعمَی القُلُوبُ الّتِی فِی الصّدُورِ'' (سورہ ۲۲ ، آیت ۴۶)

اس آیۂ کریمہ میں کفار و مشرکین مکہ کی طرف اشارہ ہے جن کے تجارتی قوافل یمن میں پائے جانے والے آثار عاد و ثمود کو دیکھتے تھے اور شمال میں روم کی بستیوں کے کھنڈرات کا نظارہ کرتے تھے ، مگر انھیں عبرت نہ ہوتی تھی ۔ اس لیے کہ ان کی آنکھیں تو تھیں مگر بینا نہ تھیں ۔ ان کی یہ ''تنگیٔ چشم'' ''کثرت نظارہ سے بھی وا نہ ہوتی تھی'' ۔ آیت کا معنی ہے ''کیا یہ لوگ فرش زمین پر چلتے پھرتے نہیں ؟ پھر انھیں وہ دل میسر آ جانے چاہییں تھے جن کی مدد سے یہ سوچ سکتے ، وہ کان میسر آ جانے چاہییں تھے جن کی مدد سے یہ سن سکتے ، اصل بات تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں'' ۔

تاریخ ماضی اور آثار قدیمہ نے یہی درس دیا کہ معاشرے خدائی ہدایت پر مبنی اصولوں کی بدولت باقی رہتے ہیں ۔ جہاں فطری اصولوں یعنی خدا کی عطا کردہ فطرت صالحہ کے تقاضوں کی خلاف ورزی کر کے آدم نے اپنی مرضی کو اختیار کیا وہیں نقصان سے دو چار ہوا ۔ اس لیے کہ ہدایت خداوندی سے محروم فکر و نظر کا انتخاب درست اور صحیح ہوتا ہی نہیں ۔ لہذا کوئی انسانی نظام پائدار نہیں ۔ پھر انسان کا وضع کردہ کوئی نظام ایسا نہیں جو

مختلف معاشروں کے لیے قابل قبول ہو - جارج فرائڈ مین لکھتا ہے :

"The orthodox natural law theory based its absolutes on the revealed truths of religion. If we attempt to secularize jurisprudence, where can we find an agreed basis of values". 1

اس ضمن میں ہم بعض تفصیلات اس مقالے میں قلمبند کر چکے ہیں جس کا عنوان ہے "قرآنی تصور تاریخ اور علامہ اقبال"۔ اب رہا بنو آدم کے افراد کا مطالعہ' ذات تو ظاہر ہے کہ ہر فرد بشر ایک انوکھا مظہر ہے ، وہ دنیا میں اکیلا آتا ہے ، اکیلا چلا جاتا ہے - وہ اپنے خالق کے حضور میں اپنے اعمال کی جزا و سزا پانے کے لیے بھی اکیلا ہی پہنچتا ہے - کوئی شخص عوضاً نہیں پیدا ہوتا ، کوئی شخص عوضاً نہیں مرتا ، حیات اپنی اپنی ، ممات اپنی اپنی ، اسی طرح جواب دہی بھی اپنی اپنی ، ہاں جواب دہی بقدر شعور ، جو جتنا صاحب علم و شعور ہے اتنا ہی زیادہ ذمہ دار ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

"وَیلٌ لِلجَاهِلِ مَرَّةً وَ لِلعَالِمِ سَبعَ مَرَات" ۲

"وبال ہے جاہل پر ایک بار اور عالم پر سات بار"

کیا فرد بشر اپنی تکمیل پر قادر ہے ؟ کیا وہ بشری غایت کو پا لیتا ہے ؟ کیا وہ حقیقی معنوں میں آدمی بن جاتا ہے - حق یہ ہے کہ اولاد آدم کے سوا تمام مخلوقات عالم اپنی اپنی غایت کو قانون فطرت کے تحت خود بخود پا لیتی ہیں - ایک بیج اگتا ہے ، پورا درخت بنتا ہے ، پھولتا ہے ، پھلتا ہے ، پھر نئے تولیدی بیج دے کر اپنا چکر پورا کر دیتا ہے - یہی حال حیوانوں کا ہے - وہ بھی اپنی نوع کی غایت تک پہنچ جاتے ہیں ، فطرت پہنچا دیتی ہے لیکن پودے زمین گیر ہیں - یہی حال حیوانات کا ہے مگر

---

1. Legal Theory, London (1967) P. 126

۲. الفتح الربانی ' ص ۹۴

بہر حال وہ حرکت پر قادر ہیں۔ سب کا وجود مادی حدود کے اندر محدود ہے ، ان کی معروف معنوں میں نفسی زندگی نہیں ، ان کی اپنی مرضی ، ان کا اپنا انتخاب ، ان کا اپنا پروگرام ان کی زندگی کے مراحل میں کہیں داخل نہیں ہوتا ، وہ فقط آئین فطرت کے تابع ہیں ۔ حیوانوں کو اللہ تعالیٰ نے مخصوص جبلتیں دی ہیں ۔ وہ حیوانوں کو چلائے اور جلائے رکھتی ہیں ۔ نباتات بھی مسئولیت سے آزاد اور حیوانات بھی ، نہ اختیار نہ جواب دہی ، مگر بنو آدم کا مسئلہ بالکل جدا ہے ۔

آدمی پیدائش سے موت تک ایک ہی سطح پر نہیں رہتا ۔ اس کی ایک سطح حیوانی ہے ، وہاں وہ جبلتوں کے تابع ہے ۔ پھر ذرا بیدار ہوتا ہے تو عقل کی مداخلت اور رہبری شروع ہو جاتی ہے، پھر اس کو عقائد اور افکار کی دولت نصیب ہونے لگتی ہے ۔ ہوتے ہوتے ، اگر ٹھیک تربیت میسر آ جائے ، تو وہ ایمان محکم اور وجدان کی نعمت سے بھی بہرہ یاب ہونے لگتا ہے ۔ گویا آدمی میں عزم ، فکر ، نظر ، مسرت ، پسند ، ناپسند ، ظلم مہربانی ، خود غرضی ، ایثار اور نہ جانے کیا کیا جوہر نمودار ہوتے ہیں ، وہ اوپر کو چلا جائے تو اعلائے علیین تک پہنچے اور نیچے کو لڑھکے تو 'اسفلُ السافلین' تک گرے ، اس کی بلندی بعد از خدا بلند ترین اور اس کی پستی ہر پست سے پست تر ۔ آدمی اپنے مکانی پہلو کی رو سے مادی وجود ہے ، ایک مشت خاک لیکن یہ تو آغاز ہے ، انتہا تو نہیں ، علامہ اقبال فرماتے ہیں :

"رہی یہ بات کہ اعلیٰ کا صدور ادنیٰ سے ہوتا ہے سو اس سے اعلیٰ کی قدرو و قیمت اور مرتبے میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ اہم بات یہ نہیں کہ کسی چیز کی ابتداء کیونکر ہوئی اہم بات یہ ہے کہ جس چیز کا صدور ہوا اس کی صلاحیتیں کیا ہیں ، معنیٰ اور مطلب کیا ہے ، اس کی انتہا کیا ہے ،

یعنی اس کی رسائی کہاں تک ہے ؟ [۱]

مادی اعتبار سے آدمی جبلی تقاضوں کے تابع ہے ۔ یہ وہ سطح ہے جہاں بے زمام جبلتیں فرمانروائی کرتی ہیں ، جبلتوں میں اساساً کوئی خرابی نہیں ، خرابی ان کے بے لگام ہونے میں ہے ۔ ہر قوت جس سے کام لینا ہو اسے پابند آئین کرنا ضروری ہے ۔ ظاہر ہے کہ تابع ضبط ہونے کا معنی مٹ جانا نہیں ۔ ہر جبلت آدمی کی جوہری قوت کا مظہر ہے مگر تناسب و توافق کے بغیر وہ جبلت وحشی رہتی ہے ۔ سدھائے ہوئے منہ زور گھوڑے مفید اور کارآمد ہیں اور اگر وہ سدھائے ہوئے نہ ہوں ، پابند لجام بھی نہ ہوں تو محض وحشی لہذا ناکارہ ۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ جبلت سے تعقل تک بڑی طویل مسافت ہے اور پھر تعقل کا وجدان بیدار سے ربط پیدا ہوتے بڑا وقت لگتا ہے ، آدم کی جبلت قوت ناطقہ کے تابع ہو اور پھر ایمان و ایقان کی رہبری میسر ہو تو جب جا کر انسان انسان بننے لگتا ہے ۔ یہ وہ اندرونی امکانات ہیں جن سے حیوانات سر تا سر محروم ہیں ، اس باب میں حضرت علامہ کہتے ہیں :

> ''یوں بھی ارتقائے حیات پر نظر رکھی جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ شروع شروع میں اگرچہ طبعی کا نفس پر غلبہ ہوتا ہے لیکن پھر جیسے جیسے نفس طاقت حاصل کرتا ہے طبعی پر چھا جاتا ہے اور اس لیے عین ممکن ہے کہ آخر الامر اس سے بالکل آزاد ہو جائے ۔ '' [۲]

جب آدمی اس مسئلے سے آگاہ ہوتا ہے کہ اس کی ترجیحات کیا ہیں ، یعنی اسے کس امر کو کس امر پر ترجیح دینا ہے ، تو یہ آگہی شخصی وحدت کی سمت میں نقطہ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے ۔ شخصیت یا ذات کو ارتقایاب ہو کر آخر حصول وحدت پر قادر ہونا ہے ۔ اگر کوئی شخص وحدت سے محروم ہے

۱- تشکیل جدید ، ص ۱۶۰ ۲- تشکیل جدید ، ص ۱۶۱

تو گویا وہ انفرادی ذات اور وجود سے محروم ہے - وہ بظاہر موجود ہے مگر حقیقتاً نابود ہے - شخصیت اپنے تشخص کے باعث شخصیت ہوتی ہے - جہاں ایک شخص میں کئی شخصتیں ہوں ، وہ گویا اپنی خودی تک رسائی حاصل نہ کر سکا - وہ ''بے خود'' شخص ہے - وہ شخص اب یہ ہے ، جب وہ ہے ، پھر نہ یہ نہ وہ - ایسا فرد نا فرد ہے- فرد وہ ہے جو ''واحدُ الوُجود'' ہے -

مگر انسانی ہستی کو وحدت اور اکائی بنانے کے باب میں صرف علوم کتابی و نصابی کافی نہیں - کوئی شخص بیشک ماہر فقیہہ ہو ، انجنیئر ہو ، بڑا فائق صناع ہو ، مقبول و معروف طبیب ہو ، پختہ کار شاعر ہو ، صاحب تجربہ معلم ہو ، کہنہ مشق جج ہو ، لیکن یہ سب حیثیتیں علم و مہارت کی نسبتیں ہیں اور حوالے- آیا کوئی انجینئر ، معلم ، جج ، صناع ، شاعر وغیرہ از روئے شخصیت خود اپنی ذات میں ایک ''اکائی'' ہے ؟ کیا وہ وحدت کا مالک ہے ، کیا وہ فرد ہے ، یا جہاں اقرار کا معاملہ آئے وہاں یہ بھی ہے اور وہ بھی ، مگر جہاں کردار کی منزل آئے وہاں نہ یہ نہ وہ ، لہذا وہ وجود بحیثیت فرد آدم کچھ بھی نہیں - فکر و نظر ہم آہنگ نہ ہوں اور نظریہ و عمل میں مطابقت نہ ہو تو آدمی خواہ کسی بھی کمال کا مالک ہو ایک معنبر خوش پوش ، خوش وضع ، خوش گفتار دو پایہ ہے - اس لئے کہ جس ذات میں افکار و نظریات کا انتشار ہو اور روح پر مادی تقاضے غالب ہوں ، وہ ذات ابھر ہی نہیں سکتی ، بقول حضرت علامہ :

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی ! !
خودی کی موت ہے اندیشہہائے گوناگوں

آدمی کے ننھے سے وجود میں پوری کائنات کے سارے بنیادی عناصر کار فرما ہیں - اس لئے ہر فرد اپنی ذات میں ایک جہاں صغیر (Microcasm) قرار پاتا ہے - اس امر کا یہ حتمی تقاضا

ہے کہ اس میں نور خداوندی کا بھی کوئی ذرہ موجود ہو ۔ اس لیے کہ ہر زمین و آسمان کا نور اللہ کی ذات ہے اور آدم میں خدائی صفات کا پرتو بالقوۃ موجود ہے یعنی اس کے اندر وہ جوہر مخفی ہیں جو بروئے کار آنے کے منتظر رہتے ہیں ۔ ان مضمر امکانات کا بروئے کار لانا ہی در حقیقت فرد آدم کا اپنی ذات کی تکمیل یا خودی تک رسائی حاصل کرنا ہے اور جب وہ اپنی خودی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کا مقام فرشتوں سے بلند تر ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ نفخ روح (اللہ کا آدم کے پتلے میں اپنی روح پھونکنا) ایک بیدار حقیقت بن جاتا ہے ۔ ایسے عالم میں فرد آدم "واحد الوجود،، یعنی ایک مستحکم اکائی بن چکا ہوتا ہے ۔ اس کو مادی تقاضے مغلوب نہیں کر سکتے ، الٹا وہ حکم خداوندی کی روشنی میں ہر مادی اور جبلی تقاضے کو مسلمان کر چکا ہوتا ہے ۔

نباتی ، حیوانی اور جبلی سطح سے بڑھتے بڑھتے صحیح معنوں میں نائب خدا بن جانا ہی سفر نامہ خودی ہے ، عمل حیات ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک خدا پر ایمان محکم و پائدار میسر نہ ہو ۔ حضرت علامہ نے دو مصرعوں میں اس حقیقت کو کس شان سے بیان کیا ہے ، یعنی خود آگاہی کا مطلب ہے کہ آدمی غلام وجود نہ ہو ، وہ فقط احکام الٰہی کا تابع ہو :

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

ہر مطلوب اپنے طالب پر اثر انداز ہوتا ہے ، ہر مقصود اپنے قاصد پر اپنا پرتو ڈالتا ہے ۔ حیوان کے پجاری میں حیوانی خصلت آنی چاہیئے ، پتھر کے عادت گذار میں حجریت کو در آنا چاہیئے ، مشین کے بندے میں مشینی اوصاف رونما ہونے چاہیں ، اس اعتبار سے بتوں کے پجاری اشخاص کا تصور کریں ، وہ محض ایک بت کو

تو نہیں پوج سکتا ۔ کوئی ایک بت سارے اوصاف اور ساری خوبیوں کا مالک نہیں ہو سکتا ، ہاں بہت سے بتوں کے مقابل ایک بت کو بڑا قرار دیا جا سکتا ہے ۔ فقط ایک بت سے کام نہیں چلتا ۔ اگر ایک بت کفایت کرتا تو ایک ذات خداوندی کو کیوں نہ اپنا لیا جاتا ؟ اب ہر بت کے اپنے اوصاف ہیں ، پجاری کی شخصیت پر کوئی ایک بھر پور پر تو نہیں پڑتا ، نتیجہ یہ کہ مشرکوں میں شخصی وحدت کا تصور نا ممکن ہے ۔ مسلمان کہلانے والا اگر شخصی وحدت سے محروم ہے تو یہ اس کے ایمان کی کمزوری ہے ، وہ وحدت کے حصول پر قادر ہے ؛ اس کے یہاں امکانات موجود ہیں ، اس کا عقیدہ توحید الٰہی اس امر کی مضبوط ترین ضمانت ہے ، مگر بت پرست میں تو ایسا کوئی امکان ہی نہیں ۔ اس کی کوئی شعوری کوشش مدد نہیں دے سکتی ، اس لئے کہ اس شعور کی ساخت ہی مشرکانہ ہے ۔

A M. Hocart کا قول ہے :

"جیسا دیوتا ویسے ہی اس کے حضور میں بھینٹ چڑھانے والے ، اس لئے کہ پجاری اپنے دیوتا کے نمائندے ہوتے ہیں ، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ دیوتا کس کس طرح کامیاب ہوئے ۔" [1]

اسی آہنگ کے ساتھ یہی مصنف اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتا ہے :

"(یونان میں) بنیادی نظریہ وہی ہے جو ہندوستان میں ہے ، جو زندہ ہیں ان کا رویہ آنجہانیوں جیسا ہے ۔ دیوتاؤں نے ایک دوسرے کو دھوکا دیا ، ایک دوسرے پر زیادتی کی ۔ اب ان کے جانشینوں کا بھی فرض ہے کہ وہی کچھ کریں ۔ یہ رویہ زندگی کے ساتھ جس قدر مربوط ہندوستان میں ہے اس قدر کسی دوسرے ملک میں نہیں ، [2]

Life Giving Myth. P. 211 1. 2.

اور واضح ہے کہ پوری کائنات میں کوئی معاشرہ جو بظاہر تمدن کے دریائے رواں سے فیضیاب ہونے کے باوصف نفسیاتی طور پر پانچ ہزار سال کی بت پرستی پر قائم ہو ، اس معاشرے میں بتوں کی تفرقہ انگیزی کا اثر کتنا نمایاں ہوگا ۔ ایسے معاشرے میں آدمی خود اپنی ذات میں بھی سب سے زیادہ منقسم رہے گا اور سوسائٹی کو بھی ایک نہ ہونے دے گا۔ برہمن ، کھشتری ، ویش اور شودر والا معاشرہ اور ہریجنوں اور اچھوتوں والی سوسائٹی پوری دنیا میں کہیں نہیں ، (قدیم وحشی قبائل اگر کہیں ہیں تو وہ اس ضمن میں نہیں آتے) لہٰذا ہندو معاشرے میں ، جو کائنات میں واحد اور حقیقی مشرک معاشرہ ہے کسی شخصیت کا پیدا ہونا جو واقعی وحدت کی مالک ہو ممکن ہی نہیں ۔ ہندو سوسائٹی کا بڑے سے بڑا آدمی بھی زیادہ سے زیادہ مسٹر موہن داس کرم چند گاندی ہو سکتا ہے ۔

''آدمی بھول جاتا ہے کہ کائنات ایک وحدت ہے ۔ وحدت اس لیے کہ اس کا خالق ایک ہے اور اس خالق کی قدرت کاملہ کی بدولت ہر شے آپس میں دور و نزدیک سے مربوط ہے ،، [1] یہ وہ تعلیم و تلقین ہے جس پر قرآن نے زور دیا ہے ، اگر خدا ایک نہ ہوتا تو کائنات بھی ایک نہ ہوتی ۔ ہر خدا کی اپنی اپنی حدود خدائی ہوتیں اور پھر وہ اپنی اپنی حدود میں رہتے ۔ کیوں ؟ ـــــ نہ ایک فطرت اشیا ہوتی ، نہ ایک ضابطہ ، کیا ایسے میں دنیا باقی رہ سکتی تھی ؟ خدائے تعالیٰ نے اسی لئے تو ارشاد فرمایا ہے :

''لَو کَانَ فِیھِمَا اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ،، [2] (سورہ ۲۱ ، آیت ۲۲)

(اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں خدا کے علاوہ اور معبود بھی ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو چکے ہوتے)

1. Islamic Ideology, by Dr. Khalifa Abdul Hakim, P. 152

سیدھی سی بات ہے کہ توحید الٰہی کائنات کی وحدت اور کائنات کی وحدت توحید الٰہی پر دال ہے ۔

اس کارخانہ قدرت میں جہاں "فطرۃُ اللہ واحد ہے انسان کا انسانیت کی سمت رخ اور ارتقا درحقیقت خدائے واحد کی جانب سفر ہوتا ہے ۔ حضرت علامہ کا ساقی نامہ اسی سفر کی داستان ہے :

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالم یہ ہنگامہ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیر فرمان موت
یہ عالم یہ بتخانہ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی ہے یہ منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسمان اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتح عالم خوب و زشت !
تجھے کیا بتاؤں تری سر نوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس
مگر تاب گفتار کہتی ہے بس !
''اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلیٰ بسوزد پرم ''

جو فرد اپنے گوشت پوست کی دنیائے صغیر (Microcasm) کو مسخر کر لیتا ہے اس میں دنیائے کبیر (Macrocasm) کو مسخر کرنے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جسے حضرت علامہ نے شعر ذیل میں پورے فنکارانہ و مجذوبانہ لب و لہجہ میں بیان کیا ہے :

چیست دین برخاستن از روئے خاک !
تا ز خود آگاہ گردد جان پاک !

مطلب واضح ہے کہ آدمی کا خدا کے رخ سفر اس کا توحیدی عمل ہے اور خود آگہی کی تدریج بھی - آدمی جتنا مادی کائنات سے اونچا اڑتا ہے اتنی ہی اس میں وحدت جلوہ گر ہوتی ہے - وہ تَخَلَّقُوا بِاَخلاق اللہ (الٰہی اوصاف اپنے اندر پیدا کرو) کے باعث ''واحد الوجود،، ہوتا چلا جاتا ہے ، اور پھر جس کو فطرت الٰہی کے ساتھ مزاجی ہم آہنگی میسر آ گئی وہ خداست فاتح کائنات ٹھہرا - (George Kelsay) وضاحت کرتا ہے کہ :

''آدمی صحیح معنوں میں اس وقت آدمی بنتا ہے جب وہ حکم خداوندی کے سامنے بکمال رغبت و خشوع سر تسلیم خم کرتا ہے - اس کی تخلیق ہی اس طرح ہوتی ہے کہ وہ خدا کے بغیر زندگی سے بہرہ ور ہو ہی نہیں سکتا - ایک آزاد وجود کا مالک فقط وہی فرد کہلا سکتا ہے جو زندگی کی ہر

تفصیل میں آزادانہ مرضی کے ساتھ حکم خداوندی کے تابع ہو ،، [1]

خدا پرست بزرگان خدا میں سے سب سے واضح مثال پیغمبران الٰہی کی ہے جنہوں نے اپنی زندگی کے ہر ایک امر میں مرضی مولا کی شمع ہدایت کو پیش نظر رکھا - ہر پیغمبر خدا اپنے معاشرے کا فائق ترین انسان تھا اور اس کی شخصی ہم آہنگی اور وحدت اور اس کا استقلال لازوال ذات واحد کی ترجمان تھے - تمام پیغمبروں کی بنیادی تعلیم ایک تھی - پیغمبران خدا بنو آدم کے حق میں ، ان کی خود یابی کے مسئلے اور معاملے میں اللہ کی سب سے بڑی نعمت تھے - اگر بنو آدم کو خود انہی کی دانش پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ اقدار کے شعور سے کیونکر اور کب تک بہرہ ور ہوتے - خیر و شر ، کذب و صدق ، ظلم و انصاف ، حرص و ایثار ، غرور و انکسار وغیرہ اقدار اذہان و قلوب میں کون راسخ کرتا ، اور پھر تعمیر آدم کیونکر عمل میں آتی ؟ اسی لئے تو قرآن کریم میں خدائے تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

"یمنون علیک ان اسلموا قل لا تمنوا علی اسلامکم بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان ان کنتم صدقین ،،

(سورہ ۴۹ ، آیت ۱۷)

(یہ لوگ آپ پر احسان رکھتے ہیں کہ وہ اسلام لائے ، آپ کہہ دیجیے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو ، الٹا یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی راہ پر لگایا بشرطیکہ (تم دعوائے اسلام میں سچے ہو -)

بنو آدم کائنات کی ہر شے سے مختلف اور برتر امکانات کے مالک ہیں - لہذا ان کی تربیت اور تکمیل کے وسائل بھی دوسری مخلوقات سے مختلف درکار ہیں - ان کی فقط بدنی ہی نہیں روحانی

1. Racism and the Christian Understanding of Man, P. 76

پرورش بھی کرنا ہوتی ہے اور پھر یہ کہ بدنی پرورش میں بھی حلال و حرام اور لقمہ حرام کے اثرات اپنے نتائج پیدا کرتے ہیں ، اگر روح بدن سے کوئی الگ شے ہوتی تو بدن کو پاک اور حلال اشیاء سے جو بطریق جائز حاصل ہوتی ہوں پالنا کیوں ضروری ہوتا ؟

حضرت ابوالنجیب ضیاء الدین سہروردی جن کا نام عبد اللہ بن قاصر تھا اور جو حضرت شہاب الدین سہروردی کے چچا تھے لکھتے ہیں کہ جس شخص کے وجود میں لقمہ حرام شامل ہو جائے وہ طاغوتی آواز اور الہام میں تمیز کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا ۔ [۱]

چنانچہ حرام خور اور بد نیت قوم اقدار و معیار کے شعور سے محروم ہو جاتی ہے ۔ وہ ابلیسوں کو اپنا ہادی اور مقتدیٰ بنا لیتی ہے ۔

آدمی خود اپنا خالق نہیں ، لہذا وہ اپنی حقیقی حیثیت اور قدر و قیمت کو نہیں جان سکتا ۔ وہ اپنے بنائے ہوئے معلموں کے ذریعے بھی اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا ۔ وہ خالی جسم نہیں ، روح بھی ہے ۔ دونوں کا ملاپ اتنا گریز پا ہے کہ کسی مشین کے بس کا روگ نہیں ۔ ہاں کوئی روحانی طور پر فائق تر شخص کسی فرو تر شخص پر ایک حد تک حاوی ہو سکتا ہے ۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ نے فرمایا ۔

"اتقوا فراسۃ المومن لانہ ینظر بنور اللہ" ۔ [۲]

(مومن کی فراست سے ڈرو اور خبردار رہو اس لیے کہ وہ نور خداوندی کی مدد سے دیکھتا ہے ۔)

۱۔ عوارف المعارف ، دارالکتاب العربی ، بیروت ، ص ۴۶۴
۲۔ الفتح الربانی ، ص ۱۰

اور ایسے ہی اہل ایمان ہیں جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''جواسیس القلوب،، قرار دیا تھا ۔ مگر وہ فائق افراد وہی ہیں جن کے وجود میں حاکمیت اور بالا دستی روح کی ہے ۔ جن کے وجود میں بدن روح کے احکام کی یکسر تعمیل کرتا ہے ۔ بندگان خدا دوسروں پر ، بالغ تر وجدان کے باعث یا دل بیدار تر کے سبب سے حاوی ہو جاتے ہیں ۔ یہ حالت پیغمبروں ہی کے بتائے ہوئے طریق عمل کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے ۔ خدا مست ہونے کے باب میں کوئی انسان پیغمبروں کا ہمدرجہ نہیں ہو سکتا ۔ ہمارا عقیدہ ہے اور وہ ہمارے پختہ ایمان پر استوار ہے کہ اللہ کی تعلیمات اور رہبری قرآن کی صورت میں تکمیل کو پہنچی ۔ قرآن تمام کتب سماوی کی روح کی نمائندگی کرتا ہے اور تکمیل بھی ۔ اسی طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں آپ سے پہلے آنے والے جملہ پیغمبروں کی سیرت تکمیل یاب ہوئی ۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ رسالت کی تکمیل ہی سلسلہ رسالت کے اختتام کی دلیل ہے ۔

حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے روپ میں کامل ترین عملی ضابطہ اور قرآن کریم کی صورت میں کامل ترین تحریری آئین حیات بنو آدم کو میسر آ گیا ، چنانچہ خداوند کریم نے قرآن میں اعلان کر دیا کہ ''اب راہ ہدایت بھی واضح ہے اور گمراہی بھی عیاں ہے ۔ دین کے بارے میں کسی پر جبر نہیں ،، جو چاہے راہ ہدایت چن لے اور جو چاہے گمراہی اختیار کر لے (سورہ ۲ ، آیت ۲۵۶) ۔

ختم نبوت حضرت علامہ کے نزدیک تمام بنو آدم کی وحدت کے لیے ضروری تھی ، اگر خدا مرکز کون و مکان ہے اور وہی ایک مرکز ہے تو اسی طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

عالم انسانیت کا واحد مرکز ہیں - انسانیت کو وحدت سے ہمکنار کرنے کی خاطر کسی ایک سیرت کو چراغ ہدایت ماننا ہوگا - ایک مرکز کے بغیر شخصی اور ذاتی انتشار بھی دور نہیں ہو سکتا ، کامل ترین سیرت ایک ہی ہو سکتی ہے - سب سے برتر شخص ایک ہی ممکن ہے - جب یہ فیصلہ ہو جائے اور ایک ہی نمونہ و مثال طے پا جائے تو پھر تقلید و انقیاد کے باب میں انتشار ختم ہو جاتا ہے - اس طرح حضرت علامہ کے نزدیک ختم نبوت بنو آدم پر بہت بڑا احسان الہی ہے ، اس لیے کہ ختم نبوت نے بنو آدم کو ایک وسیع برادری بن جانے کا موقع بہم پہنچا دیا ہے -

لا نبی بعدی ز احسان خدا ست ! پردۂ ناموس دین مصطفیٰ است
قوم را سرمایہ ملت ازوست حفظ سر وحدت امت ازوست
حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست تا ابد اسلام را شیرازہ بست

ایک خدا اور پھر ایک رسول کا کامل ترین نمونہ اور ایک ہی ضابطہ حیات سب کے لیے ہو اور سب افراد اسی کو قبول کرلیں تو سب ہم نظر بھی ہوں گے اور ہم دل بھی - ہر ایک فرد اپنی ذات میں ایک مربوط وحدت ہوگا - اس طرح اسلام تمام اہل اسلام کا کنبہ بھی ہوگا اور گھر بھی - اس کے باعث اولاد آدم تمام نسلی لسانی اور علاقائی تعصبات سے بالا ہو جائے گی - غلام اقوام اور حاکم اقوام کے امتیازات ختم ہو جائیں گے - یہی ہوگی ''خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ'' - ''ہم نے تمہیں ایک نفس سے خلق کیا'' - کی تفسیر - یہی وہ تمنا ہے جس کا حضرت علامہ شعر ذیل میں اظہار کرتے ہیں :

یک شو و توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن

علامہ اقبال اور کتاب زندہ

آئینۂ قرآن کے حوالے سے اگر آدم خودبین یعنی خود شناس ہو اور اپنی ذات سے آگاہی رکھتا ہو تو اسے یقین میسر آ جاتا ہے کہ اس کا مقام بہت ہی بلند ہے ۔ اس باب میں علامہ اقبال نے اپنی تائید گوئٹے سے بھی کرائی ہے ۔ علامہ لکھتے ہیں :

"قرآن مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ان گونا گوں روابط کا ایک اعلیٰ اور برتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان ہیں ۔ قرآنی تعلیم کا یہی وہ بنیادی پہلو ہے جس کے پیش نظر گوئٹے نے باعتبار ایک تعلیمی قوت اسلام پر من حیث الکل تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمن (Eckermann) سے کہا تھا ، تم نے دیکھا اس تعلیم میں کوئی خامی نہیں ، ہمارا کوئی نظام اور ہمیں پر کیا موقوف کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا "[1]

گمان یہی ہے کہ گوئٹے نے خود قرآن نہیں بلکہ ترجمہ پڑھا اور اس کے باوجود اتنا متاثر ہوا ۔ وہ اگر عربی قرآن یعنی فی الواقع قرآن پڑھنے اور اس کے مفاہیم کو براہ راست سمجھنے پر قادر ہوتا تو اس کا دل زندہ نہ جانے اسے کیا سرشاری عطا کرتا ، اس لئے کہ ترجمہ قرآن خواہ کتنا ہی معیاری کیوں نہ ہو اصل کے بھر پور معانی کو اور پھر اس کے تناسبات اور آہنگ کے اثر کو قطعاً منتقل نہیں کرسکتا ، اس ضمن میں پروفیسر فلپ حتی لکھتے ہیں :

"اسلوب قرآن اسلوب الٰہی ہے ، بے نظیر ، ناقابل تقلید ۔ یہی اس کا سب سے بڑا معجزہ ہے ۔ اس کی تجوید میں بڑی تاثیر ہے ۔ اس کا فنی جوہر اور جذبات کے تاروں کو ٹٹولنے

---

۱ ۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، لاہور ، بزم اقبال ۱۹۵۸ء ص ۱۳

والا پیغام ترجمے کی صورت میں اپنا کمال کھو بیٹھتا ہے ،، [1]

ترجمہ بہر حال ترجمہ ہے ، وہ قرآن نہیں ، قرآن تو وہی ہے جو عربی زبان میں اترا - یہ قرآن ہی ہے جو آدم کو جرأت آموز زندگی بخش پیغام سناتا ہے کہ وہ نائب خدا ہے لہذا خدا کے بعد جملہ عناصر پر فرمانروائی اسی کی ہو گی - اسے بلندیوں ، پستیوں ، ہواؤں ، بجلیوں ، شعلوں ، برفوں ، طغیانیوں ، جنوں ، عفریتوں ، وحشی حیوانوں اور درندوں نیز موسموں کے گونا گوں انقلابوں سے ہر گز نہیں گھبرانا چاہیئے ، اس لئے کہ گو اس کا وجود بظاہر بڑا عاجز ہے مگر اس کے اندر روح خداوندی کا جو ذرۂ نور ہے وہ مفتوح و مغلوب ہونے کے لئے نہیں آیا ، لہذا آدم کو اپنے اندر تغیر اور انقلاب پیدا کرنا ہو گا ، ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کی خاطر اللہ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے کام لینا ہو گا - جی چاہتا ہے کہ بال جبریل کی نظم ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے ،، ساری نقل کر دی جائے :

کھول آنکھ ، زمیں دیکھ ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو ، معرکۂ بیم و رجا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل ، یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک ، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ ، یہ صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

---

1. Islam, A Way of Life, Oxford Press, P. 27, 28

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر ، اثر آہ رسا دیکھ
خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ
نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

پہلے دو بندوں میں کائنات کے مختلف مناظر و مظاہر دکھائے گئے ہیں تا کہ آدم فطرت کے کاروبار کا گہری نظر سے مطالعہ کرے ، نیز آدم کو یہ خبر دی گئی ہے کہ تم ان عناصر پر قابض ہو جاؤ گے اور اس لئے قابض ہو جاؤ گے کہ اللہ نے تمہارے وجود میں وہ تمام جوہر ودیعت کر دئیے ہیں جو تمہیں حاکمیت کے قابل بناتے ہیں ۔ طبعی مواقع انسان کے عزم و ارادہ کی راہ نہیں روک سکتے ، جان ڈیوی لکھتے ہیں :

"Knowledge is power and knowledge is achieved by sending the mind to school of nature to learn her process of change." 1

(علم قوت ہے اور یہ قوت اس طرح حاصل ہوتی ہے

1. Reconstruction in Philosophy (2nd Ed. 1959). P. 49

کہ ذہن کو مدرسۂ فطرت میں تربیت پانے کے لئے بھیج
دیا جائے تاکہ اسے عمل تغیر کا درس میسر آ جائے) ۔
انسان کی بے پناہ صلاحیتوں کے اس مفہوم کو بال جبریل
کی اشاعت سے قبل حضرت علامہ نے اپنے خطبات میں بایں الفاظ
بیان کیا تھا اور قرآن کی ضمانت دے کر بیان کیا تھا :

''جب اس کے گرد و پیش کی قوتیں اسے اپنی طرف
متوجہ کرتی ہیں تو وہ ان کو جیسی چاہے شکل دے
سکتا ہے اور جس طرف چاہے موڑ سکتا ہے ، لیکن
اگر اس کا راستہ روک لیں تو اسے یہ قدرت حاصل
ہے کہ اپنے اعماق وجود میں اس سے بھی ایک وسیع
تر عالم طیار کر لے جہاں اس کو لا انتہا مسرت
اور فیضان خاطر کے نئے نئے سرچشمے مل جاتے ہیں ۔
اس کی زندگی میں آلام ہی ہیں اور اس کا وجود
برگ گل سے بھی نازک ۔ بایں ہمہ حقیقت کی کوئی شکل
ایسی طاقتور ، ایسی ولولہ خیز اور حسین و جمیل
نہیں جیسی روح انسانی ، لہذا باعتبار اپنی کنہہ کے ،
جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے ، انسان ایک تخلیقی
فعالیت ہے ، ایک صعودی روح جو اپنے عروج اور
ارتقاء میں ایک مرتبہ وجود سے دوسرے میں قدم
رکھتا ہے ۔ ''فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ ۝
وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ ''

(سورہ ۸۴ ، آیت ۱۶ تا ۱۹)

(ترجمہ آیات : میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات
کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے اور
چاند کی جب وہ پورا ہو جائے کہ تم کو ضرور ایک

درجے یا حالت کے بعد دوسرے درجے یا حالت پر پہنچنا ہے) [1]

شفق کے بعد رات اور رات کا احاطہ و غفلت ، پھر بیداری اور نئی زندگی ، چاند کا آغاز اور اس کی تکمیل - اللہ نے ان سب چیزوں کی قسم کھا کر کہا کہ تمہارا ارتقاء اور سفر حیات و رفعت جاری رہے گا ، یہ کائنات محض تکرار نہیں ، یہ بڑھتی ہوئی اور ہر لحظہ ترقی پذیر کائنات ہے - یہاں رُکاؤ نہیں اور بالخصوص انسان وہ شے نہیں جسے ایک ہی حالت پر رہنا ہو - انسان کی ترقی کی راہ میں دنیا کی ہر شے مدد ہے اور اس راہ کی سجاوٹ ہے اس کی موت بھی زیادہ سے زیادہ نیند ہے جس کے بعد وہ تازہ دم ہو کر اٹھے گا ، اور مزید آگے بڑھے گا -

اس طرح قرآن حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ ایک دور کے بعد دوسرا دور آئے گا اور قرآن کے نزدیک ہر دور کی حیثیت محض ساعات کی سی ہے ، لہذا حامل قرآن یعنی مرد مسلمان کو ہمت اور حوصلے سے یہ منازل طے کرنا چاہئیں - مرد مسلمان کے فسانے اور زمانے بے حساب ہیں - وہ کسی ایک منزل پر نہیں رک سکتا وہ رکے تو قرآن ایک نئی دنیا لاکے سامنے رکھ دیتا ہے اور اس کی تسخیر پر ابھارتا ہے مگر یہ کتاب زندہ کسی صاحب ایمان کے دل زندہ کی طلب گر ہے :

صد جہان تازہ در آیات اوست
عمر ها پیچیده در آنات اوست
یک جہانش عصر حاضر را بس است
گیر اگر در سینہ دل معنیٰ رس است
بندۂ مومن ز آیات خدا است
ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۱۸

چوں کہن گردد جہانے در برش!
می دھد قرآن جہانے دیگرش!

(قرآن کی آیات میں سینکڑوں نئے جہانوں کے امکانات مضمر ہیں قرآن کی ساعات و آنات میں کئی کئی زمانے لپیٹے اور تہ کئے ہوئے پڑے ہیں ، اس کی آیات میں مضمر جہانوں میں سے فقط ایک جہان پورے عصر حاضر کے لئے کافی ہے ، اگر سینے میں دل معنی یاب موجود ہے تو اس مفہوم کو پالے بندہ مومن بھی اللہ کی آیات میں سے ایک آیت ہے ، لہذ ہر جہاں اس کے وجود کے لئے اس طرح موزوں ہے جس طرح قبا ۔ کہنہ قبا کی طرح جب کوئی دنیا پرانی ہو جاتی ہے تو قرآن کوئی نئی دنیا اس کے سپرد کر دیتا ہے) ۔

ان اشعار میں ''لَتَرْکَبُنَّ طَبَقاً عَنْ طَبَقٍ'' کی ایک گونہ تشریح مل جاتی ہے اس ضمن میں عباس محمود العقاد کا اقتباس ذیل بھی مفید مطلب رہبری کرتا ہے :

''نطشے کا ایک قول ہے جو نہ جانے اس نے سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے یا از راہ مزاح، اور وہ یہ ہے کہ انسان کی حیثیت بندر اور فوق البشر کے مابین پل کی سی ہے ۔ یہ قول متین ہو خواہ تمسخر ، اس پل کو نہ بندر تعمیر کرتا ہے نہ فوق البشر ، اور نہ خود انسان اور نہ دست فطرت ، اس لیے کہ فطرت تو (بقول نطشے) کبھی بلندیوں سے پستیوں کی طرف چل پڑتی ہے اور کبھی پستیوں سے بلندیوں کا رخ کر لیتی ہے ، کوئی مقصد پیش نظر نہیں ہوتا ، ہاں جو کہنا مراد ہے وہ یہ ہے کہ انسان زمین سے آسمان تک ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے ، اور اس پل کو تعمیر کرنے والا خدا ہے اس پل کی نیو اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ہے اور چوٹی اعلاء علیین ۔ مٹی سے برآمد ہونے والا آدمی

جس کی جبلت میں ہے کہ روحانی اور عقلی آفاق کی جانب چڑھتا چلا جائے حسب ارشاد ربانی یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحاً فَمُلَاقِیْہِ (اے انسان تو تو اللہ کی سمت محنت اور مشقت اٹھاتا چلا جائے گا اور پھر اس سے جا ملے گا) وہ ضرور اللہ تک جا پہنچے گا ، اس لیے کہ وہ حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق خالق کی صورت میں تخلیق کیا گیا ہے ۔ اس کی صورت سے مراد جسدی صورت نہیں بلکہ صفات کے باب میں ہم صورت ہونا ہے ۔ اور وہ صفات ہمیں رحمت ، کرم ، علم ، عمل ، مشیت ، مجد ، عظمت ، فتح ، ابداع ، (انشا) خلاق وغیرہ ۔ اور یہ تمام اوصاف جن کا انسان سے مطالبہ کیا گیا ، انسان ان کو اپنانے پر بخوبی قادر بھی ہے'' [1]

اور یہ انسان کو پستیوں سے بلندیوں کی طرف لے جانے والا قرآن جسے خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی وہ رسی قرار دیا ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے ، ''کِتَابُ اللہِ ھُوَ الْحَبْلُ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ''۔ یہی وہ رشتہ ہے جس سے محروم ہو کر انسان انسان نہیں رہتا اور اسفل سافلین میں جا گرتا ہے ، اسی لیے تو حضرت علامہ نے فرمایا تھا :

ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفتہ شـــو

(ہم سراپا خاک ہیں اور قرآن دل ہے ۔ دل بھی آگاہ ، لہذا قرآن کو مضبوطی سے پکڑ لے ۔ وہی اللہ کی رسی ہے ، تو یا تو اپنے آپ کو قرآن کے رشتے میں موتی کی طرح پرو لے

1. حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ بیروت ، دارالکتاب العربی ص ۱۳۲ ، ۱۳۱

یا پھر ذرہ ہائے خاک کی طرح تتر بتر ہو جا)

قرآن کو دل آگاہ قرار دینا توجہ طلب بات ہے ۔

آخر انسان کیوں بار بار گرتا اور برباد ہوتا ہے ، اس باب میں انسان کو متنبہ کرنے کے لیے قرآن کریم زور دے کر کہتا ہے کہ ان اقوام کے عروج و زوال کے احوال کا مطالعہ کرو جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں ۔ وہ قومیں تم سے زیادہ طاقتور تھیں اور آج ان کے آثار کبریائی میں سے محض دھندلے نقوش باقی ہیں تاکہ اولاد آدم عبرت حاصل کرے ، ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا کہ قوموں کے زوال کا سبب یہ نہیں کہ اللہ ایک خاص مدت تک نعمت دے چکنے کے بعد ان سے یونہی شوقاً اور شغلاً توجہ ہٹا لیتا ہے اور پھر اسی طرح شوقاً اور شغلاً کسی دوسری قوم کو نوازنے لگتا ہے ۔ یہ بات نہیں ، حق یہ ہے کہ انسان خود غافل ہو جاتا ہے ، فکر و عمل کی دیانت سے اپنے آپ کو معریٰ کر لیتا ہے ، دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے لگتا ہے ، نیت میں خلل راہ پا لیتا ہے اور اس کی پوری شخصیت کا رویہ انسانی رویے کے بجائے بہیمی اور حیوانی رویہ بننے لگتا ہے ۔ چنانچہ اس تدریجی اندرونی زوال کے باعث اس میں قدرت و قوت کی کمی نمودار ہوتی چلی جاتی ہے ، لہٰذا اس کا رزق ، اس کی فارغ البالی ، اس کی آزادی اور اس کی شان رفتہ رفتہ رفت گزشت ہو جاتی ہے ۔ قرآن کا ارشاد ہے ،

"ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ" (سورہ ۸ ، آیت ۵۳)

(اور یہ (کسب زوال و عتاب) یوں ہے کہ اللہ تو کسی بھی نعمت کو جو وہ کسی پر ارزانی کر چکا ہو نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود اسے نہ بدل ڈالیں جو کچھ ان کے اندر

ہے ، یعنی جب تک وہ اپنی خصلت و سیرت خود نہ بگاڑ لیں) -

مراد یہ کہ انہوں نے حصول نعمت کے لئے اپنے اندر جو قابلیت پیدا کی تھی جب اس قابلیت ہی کو باقی نہ رکھا تو نعمت کیسے رہتی ؟ —— حضرت علامہ اقبال مطالعۂ ذات ، اور مشاہدۂ کارخانۂ فطرت کے بعد از روئے قرآن تیسرا مصدر علم و آگہی ، تاریخ کو قرار دیتے ہیں اور تاریخ کی عطا کردہ بصیرت یہ قرار دیتے ہیں کہ قومیں اپنی اجتماعی غلط کاریوں کی سزا پاتی ہیں - [1]

انفرادی سزا تو ہے ہی ، اس سے مفر کیوں ؟ وہ تو واضح حکم ہے کہ ہر ایک کو اللہ کے حضور میں آ کے اپنا نامہ اعمال پڑھنا ہوگا ، اس وقت حقائق کھل کر سامنے آ جائیں گے ، اللہ کی طرف سے فہمائش کے طور پر ارشاد ہوگا ''آج تو تیری نظر بڑی تیز ہے ''

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ،،

(سورہ ۵۰ ، آیت ۲۲)

(اور تو اس معاملے میں شکار غفلت رہا ، آج ہم نے تیری دانش و نظر پر سے پردہ ہٹا دیا ہے ، چنانچہ آج تو تیری نظر بہت تیز ہے) -

قرآن ، جو حضرت علامہ کے نزدیک کتاب زندہ ہے، زندگی آموز روح عصر کرتا ہے - اس کا بھیجنے والا علیم و حکیم ہے لہذا قرآن حکیم کی تعلیمات لا زوال ہیں اور انہیں کائنات میں رونما ہونے والے حادثات سے کسی قسم کا کوئی اندیشہ و خلل نہیں - ہر وہ بات جو حقیقت ہے وہ قرآن ہے ، باقی باطل ، اور قرآن ہی کی لا زوال حکمت میں امت مسلمہ کی قوت و حیات کا راز پوشیدہ ہے ،

---

1. The Reconstruction of Religious thought in Islam. Lahore S. M. Ashraf, 1946, P. 138

بقول علامہ :

قلب مومن را کتابش قوت است
حکمتش حبل الورید ملت است

(''قلب مومن کے لیے اس کی کتاب (قرآن) قوت ہے ، اس کتاب کی حکمت امت مسلمہ کے لیے حبل الورید کی حیثیت رکھتی ہے،،) مراد ہے جس طرح حبل الورید کے کٹ جانے سے تن میں جاں باقی نہیں رہتی اسی طرح جب قرآن سے رابطہ باقی نہ رہے تو امت مسلمہ جسد بے جان ہو کر رہ جاتی ہے -

قرآن کی تعلیمات روشنی ، دانش ، ترقی اور قوت تسخیر کی ضامن ہیں ، یہ ابدی فیصلے ہیں چند سو سال یا چند نسلوں کی بات نہیں - چھوٹے چھوٹے واقعات جن سے باطل کی قوت ابھرتی دکھائی دے وہ ابد کےسمندر میں بلبلے کی حیثیت بھی نہیں رکھتے ، خدا کی مشیئت اپنا کام کر رہی ہے اور انسان کے ساتھ جو وعدۂ تسخیر کیا گیا تھا وہ بہر صورت پورا ہو رہا ہے ، مگر انسان نا شکر گزار ہے :

''قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَکْفَرَہٗ ،، (سورہ ۸۰ ، آیت ۱۷)

(برا ہو انسان کا ، یہ کتنا ناشکرا ہے)

حق یہ ہے کہ انسان کی ہر حماقت اور ہر سر کشی اور بے صبری و کفران نعمت کے با وصف جو ازلی پیمان تھا اللہ نے اسے نہیں توڑا ، اور وہ یہ تھا :

''وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً مِّنْہُ ،،

(سورہ ۴۵ ، آیت ۱۳)

(اور اس نے (خدا) آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے تمہارے لئے اپنی طرف سے مسخر کر دیا)

چنانچہ حضرت علامہ یاد دلاتے ہیں :

آیہ تسخیر اندر شان کیست
ایں سپہر نیلگوں حیران کیست

اور اگر یہ بے بصر آدم خدا شناس بھی ہوتا تو یہ دنیا اپنی جملہ وسعتوں کے باوصف تنگیوں کا جہنم نہ دکھائی دیتی :

''ضَاقَتْ عَلیھِمُ الاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ '' (سورہ ۹ ، آیت ۱۱۸)

قرآن حکیم پوری نسل انسانی کے لیے ہے مگر جن تک قرآن نہیں پہنچا وہ قرآن پر عمل پیرا ہونے کے اتنے ذمہ دار نہیں جتنے وہ جن کے پاس پہنچ گیا ہے ان پر قرآن کا حق ہے کہ اس کو اس طرح طاق میں نہ سجائیں جس طرح برہمن بت کو طاق میں سجاتا ہے :

در صد فتنہ را بر خود کشادی
دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاق خود آ راست
تو قرآں را سر طاقے نہادی

ہوتا یہی ہے کہ جہد و عمل کی راہ اختیار کرنے کے بعد مسلمان جلد ہی غافل ہو جاتے ہیں اور زوال سے ہمکنار ہونے لگتے ہیں - سبب یہ ہوتا ہے کہ قرآن کو جو درس حیات دینے والی اور قوت بخشنے والی کتاب ہے ایک بے حس بت کی طرح طاق کی سجاوٹ بنا لیتا ہے - اس مضمون کو ذرا زیادہ تاسف اور کرب کے ساتھ ذیل کے دو شعروں میں بیان کیا گیا ہے :

خوار از مہجوریٔ قرآن شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمین افتندۂ
در بغل داری کتاب زندۂ

(تو نے قرآن کو چھوڑ دیا لہذا ذلیل و خوار ہو کر رہ گیا ،

نتیجہ یہ نکلا کہ گردش دوراں اور انقلاب زمانہ کے ہاتھوں عاجز ہو کر نالہ و فریاد کرنے لگا ، اے شبنم کی طرح زمین پر گرنے والے ! تیری بغل میں وہ کتاب ہے جو کتاب زندہ ہے ، سراسر زندگی ہے) :

نماند آں تاب و تب درخون نابش
نروید لالہ از کشت خرابش
نسیام او تہی چوں کیسہ او
بطاق خانۂ ویراں کتابش

(اس کے خون تازہ میں وہ آب و تاب باقی نہیں رہی - اب اس کی ویران کھیتی میں لالہ نہیں اگتا - اس کی نیام اس کے کیسے کی طرح خالی ہے اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اس نے اپنے ویران گھر میں کتاب کو طاق پر رکھ چھوڑا ہے -)

حضرت علامہ کا عقیدہ ہے ، اور خود قرآن کا ارشاد کہ قرآن اللہ کی رحمت ہے ، برکت ہے ، شفا ہے ، نور ہے ، اس کے باوصف اگر امت مسلمہ قرآن سے منہ پھیرے گی تو نتیجہ کیا ہو گا ؟ اور یہ امت قرآن سے منہ پھیرتی رہی ہے ، قرآن کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ اظہار فرمائیں گے کہ ''اے میرے رب'' میری قوم نے تو قرآن کو رد کر دیا تھا''

''وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ اِنَّ قَومِی اتَّخَذُوا هٰذَا القُراٰنَ مَهجُوراً''

(سورہ ۲۵ ، آیت ۳۰)

قرآن کریم کو نظر انداز کرنے اور قرآن سے رو گردان ہونے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس مسلم ملت سے دنیا جہان کی دیگر نعمتوں کی طرح قرآن بھی چھین لیا جائے گا اور ایسے لوگوں (نو مسلموں) کے حوالے کر دیا جائے گا جو اس (قرآن) کے حقوق ادا کریں گے ، بقول علامہ :

از مسلمان دیده ام تخمین و ظن
ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم آں روزے کہ محرو مش کنند
آتش خود بر دل دیگر زنند

(میں نے مسلمان کو (یقین سے محروم) ظن و تخمین میں مبتلا پایا ہے لہٰذا میرے تن میں میری جان ہر دم (مسلمان کے انجام بد کے اندیشے سے) لرزتی رہتی ہے - مجھے ڈر ہے مبادا کسی روز خدا مسلمان کو محروم کر کے اپنی محبت کی تپش کسی اور کے دل میں ڈال دے) -

حفظ قرآن الحمد للہ بڑی برکت ، بڑا نور ، بڑی نعمت ، بڑی دولت ، - مگر حفظ قرآن سے بڑھ کر جو شے قرآن کا تحفظ کرتی ہے وہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے - قرآن تقویٰ اور بر کی تعلیم دیتا ہے - اس کے مطابق ہر اس کام سے پرہیز لازم ہے جو مستوجب سزا ہو ، اور ہر اس کام کا اقدام لازم ہے جو باعث اجر جزیل ہو -

قرآن پر عمل ایک خاص نمایاں اور جیتا جاگتا رویہ پیدا کرتا ہے ، جو بدی کو قبول کر ہی نہیں سکتا ، خواہ وہ کسی رنگ میں ہو - وہ رویہ نیکی کے لیے دل میں کشش پیدا کر دیتا ہے خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو — یہ محض تعقل و تفکر کی بات نہیں ، قرآن وجدان کو بدل دیتا ہے اور اسے وجدان بیدار ہی نہیں وجدان فعال بنا دیتا ہے ، گب (Gibb) کہتے ہیں :

''وجدانی عقل فلاسفر کی طرح یہ نہیں پوچھتی کہ خیر ، صداقت یا جمال کیا ہے ؟ وہ تو بالتاکید کہتی ہے کہ ان خصوصی احوال میں یہ عمل خیر ہے اور وہ شر ہے ، یہ عدل ہے ، وہ غیر عدل ہے'' [1]

---

1. Studies in Civilization of Islam, Oxford, 1969 P 192, 193

یہ خیر و شر اور ظلم و عدل میں حد فاصل اور فرق کو نمایاں کرنے والی کتاب ۔ فرقان عظیم ۔ پوری زندگی میں اور پوری کائنات میں خیر و عدل کا نفاذ چاہتی ہے ۔

"اَنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ، یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ"

(سورہ ۱۶ ، آیت ۹۰)

(اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور بھلائی کا اور قرابت داروں پر خرچ کرنے کا اور روکتا ہے بے حیائی سے ، ناپسندیدہ امور اور سرکشی کی باتوں سے ، خدا یہی تلقین کرتا ہے ، ممکن ہے تمہیں نصیحت ہو اور تم یاد رکھو)

اس عدل اور احسان کے مفہوم کو بندۂ مومن ہی سمجھتا ہے اور وہی صحیح معنوں میں اسے اپنا سکتا اور نافذ کر سکتا ہے ۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے اور ذمہ داری اس لیے کہ ایمان اسے اس امر کی بخوبی قوت اور استطاعت عطا کر دیتا ہے ۔ علامہ کہتے ہیں کہ مرد مومن :

پیش باطل تیغ و پیش حق سپر
امر و نہی او عیار خیر و شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم
ہم بقہر اندر مزاج او کریم
ساز او در بزم ھا خاطر نواز
سوز او در رزم ھا آھن گداز
در گلستان با عنادل ہم صفیر
در بیابان جرہ باز صید گیر

(مرد مومن باطل کے مقابل تیغ ہے ، اور حق کے آگے سپر ، مومن کا امر اور نہی معیار خیر و شر ہے) ۔

اس کا عفو ، راہ خدا میں بذل و ایثار اور اس کا احسان ، عالی شان ہے ، اس کے زیر خاک چلے جانے کے باوجود اس کا فیض جاری رہتا ہے ۔

اس کا ساز (جمالی پہلو) اہل محفل کے دلوں کو نوازتا ہے اور اس کا سوز (جلالی پہلو یا سر گرمیٔ عمل) میدان جنگ میں لوہے کو پگھلا دیتا ہے۔

وہ باغ میں ہو تو ہر بلبل کا ہمصفیر ہوتا ہے ، وہ بیاباں میں ہو تو شکرے کی طرح شکار کو دبوچتا ہے ۔

پھر جہاں قرآنی آئین نافذ ہو گا اس کے نفاذ کا تحفظ بھی کرنا پڑے گا ، اس لیے کہ آدمی مزاجاً ایسا واقع ہوا ہے کہ پابندیوں سے بھاگتا ہے اور تربیت سے گریز کرتا ہے ، اسے نیچے کی طرف جانے میں دیر نہیں لگتی ، اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی روح سے منحرف ہو کر بدن کا یا بالفاظ دیگر مادے کا غلام بن کر رہ جاتا ہے ۔ مصطفیٰ الکیک (مصری مصنف) نے استاد عبدالکریم الخطیب کے حوالے سے لکھا ہے :

> ”جب آدمی اپنے روحانی پہلو سے منحرف ہو کر گوشت پوست اور خون کی مادی زندگی پر اتر آتا ہے تو اس وقت وہ درندوں اور گدھوں کی سطح سے بلند تر ہرگز نہیں ہوتا ، اس کی زندگی سراسر پیکار اور مار دھاڑ کی زندگی ہوتی ہے ، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ لمبے تیز دانتوں اور پنجوں کے بجائے زری راکٹ اور ہائڈروجنی میزائیل کو کام میں لاتا ہے“ [1]

یہ حیوانی پہلو جب غالب اور حاوی ہو جاتا ہے تو آدمی جانتے بوجھتے ، دیکھتے بھالتے اصولوں کو ترک کر دیتا ہے۔ کارخانۂ قدرت کا ہر منظر درس عبرت پیش کرتا ہے ، مگر وہ انسان نما

---

۱ ۔ بین عالَمین (دارالمعارف مصر) ص ۱۳۴

حیوان منہ پھیر لیتا ہے ۔ وہ بدنی لذات اور ہوس سے آگے سوچتا ہی نہیں ۔ نتیجہ یہ کہ وہ روز بروز زمین کے ساتھ چپکتا چلا جاتا ہے اور روز بروز مزید حیوان بنتا چلا جاتا ہے ۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے :

”وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ، وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۔ “(سورہ ۷ ، آیت ۱۷۵ ، ۱۷۶)

اے رسول ؐ) ان لوگوں سے اس شخص کا ماجرا بیان کرو جس کو ہم نے اپنی نشانیاں بہم پہنچائیں اور پھر وہ ان سے ہٹ کر الگ ہو رہا اس پر شیطان نے اس کو اپنے پیچھے لگا لیا ، نتیجہ یہ کہ وہ گمراہ ہو گیا ، اگر ہمیں اپنی مرضی کرنا ہوتی تو اس (شکار ہوس) آدمی کو اپنی آیات کی مدد سے ضرور اوپر کو اٹھا لیتے ، لیکن وہ تو زمین کے ساتھ چپکتا چلا گیا اور اپنی ہوس کے پیچھے پڑا رہا “

مصطفی الکیک کہتے ہیں :

”آدمی مزاجاً ایک تخریب پسند وجود ہے ، اور حیوانی ہوس کا بندہ ، خرابی اور بربادی کے ذوق فراواں کا مالک ، سبب کوئی نہ کوئی احساس کمتری ہوتا ہے (جسے ہوس کی ناآسودگی جنم دیتی ہے) چنانچہ وہ اس کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کے در پے نقصان رہتا ہے ۔ وہ عالم و فاضل بھی بن جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اگر اس کی حیوانیت اس پر غالب ہے تو وہ اس علم کو بھی تخریبی وسائل و آلات کی اختراع کا ذریعہ بنا لے گا ۔ وہ وسائل و آلات جو اسے قبلاً بے علمی کے باعث میسر نہ تھے ۔ پہلی اور دوسری عالمگیر جنگ کی تباہ کاریاں حیوانوں کی علمیت کا گھناؤنا منظر ہیں ۔

ایٹمی اور ھائیڈروجنی اور کوبالٹی قوتوں سے وہ کام لیا گیا کہ عقل انسانی دنگ رہ گئی ، تاہم آدمی کو وہ ذرائع ضرور بہم پہنچ گئے جن کی مدد سے وہ اپنے ہی معاشرے کو تہس نہس کر دے ، زندگی کے آثار تلف کر دے اور کرۂ ارضی کے پرخچے اڑا کر اسے گرد و غبار میں تبدیل کر ڈالے،، [1]

وحوش اور وہ بھی درندے عموماً انسانی وجود سے بدکتے ہیں - اور وحشت کے جوش میں جب موقع ملے حملہ آور ہو جاتے ہیں یہی عالم ان وحشیوں کا ہے جو شکلاً آدمی نظر آتے ہیں لہذا انسانی معاشرے کے افراد کو بھی ان سے خطرہ رہتا ہے اور پوری اجتماعی زندگی کو بھی - مگر جہاں تک اسلامی معاشرے کا تعلق ہے ہر غیر مسلم معاشرے کو اس سے کد ہوتی ہے - خدا کا انکار کرنے والوں کو قرآن نے بدترین چوپایوں اور حیوانوں میں شامل کیا ہے :

،،اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ،،

(سورہ ۸ ، آیت ۵۵)

،،خدا کے نزدیک بدترین جانور وہ انسان ہیں جو کفر کے مرتکب ہیں اور ایمان لاتے ہی نہیں،،

گویا غیر مومن کی خوئے حیوانی کو اسلامی معاشرے سے خواہ مخواہ کا بیر ہوتا ہے - بقول حضرت علامہؒ :

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بو لہبی

ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرہ قرآن پر استوار ہوتا ہے ، لہذا اس معاشرے کا تحفظ قرآن کے عمل نفاذ کا تحفظ ہے اس تحفظ کے لیے قوت بھی قرآن ہی کی روشنی میں حاصل ہوتی ہے - اس لیے کہ قرآن دفاع کو مضبوط بنانے اور مضبوط رکھنے کا حکم دیتا ہے - حق و باطل

---

۱ - بین عالمن ، ص ۱۲۴ ، ۱۲۵

کی آویزش دائمی ہے - لہذا دفاع کے ضمن میں یہ مستعدی اور تیاری بھی دائمی ہے - اسی لیے تو قرآن کی ہدایت ہے کہ :

''وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّاللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ'' (سورہ ۸ ، آیت ۶۰)

(جہاں تک بس چلے ان (کفار) کے لیے قوت (Force) تیار رکھو اور رسالے بھی ، تاکہ اپنی قوت و تیاری کے باعث تم اپنے اور اپنے خدا کے دشمنوں کو ڈرائے رکھو) -

چنانچہ حضرت علامہؒ نے شرف النساء بیگم کی زبانی وہ الفاظ برنگ شعر ''جاوید نامہ'' میں سجائے ہیں جو اسی نے مرتے دم اپنی والدہ سے کہے تھے ، ان الفاظ میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ قرآن کی ہدایت اسلامی معاشرے کی تعمیر کرتی ہے اور تلوار یعنی دفاعی قوت ہر ایسے معاشرے کا تحفظ کرتی ہے جہاں قرآن نافذ ہو :

بر لب او چوں دم آخر رسید
سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر
سوئے ایں شمشیرو ایں قرآن نگر
ایں دو قوت حافظ یک دیگرانـد
کائنات زندگی را محور انـد

(جب شرف النساء کے لبوں پر دم آخر آیا ، تو اس نے اپنی ماں کی طرف پر اشتیاق نظروں سے دیکھا کہا ''اے ماں'' اگر آپ میرے راز سے آگاہ ہیں تو پھر اس شمشیر اور قرآن کو ذرا دیکھیں یہ دو قوتیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کی محافظ ہیں - زندگی کا اور کائنات کا محور یہی ہیں) -

اور مزید یہ کہا کہ قرآن اور شمشیر کو مجھ سے جدا نہ کرنا ، میری قبر پر گنبد تعمیر کرنا ، نہ قندیل جلانا ، بس

قرآن اور شمشیر کا وہاں وجود رہے ، میری تربت کے لیے یہی سر و سامان کافی ہے - یعنی آئین حیات قرآن ہے جس میں فرد اور معاشرے کے حقوق و فرائض اساسی اصولوں کے انداز میں درج ہیں اور جس میں یہ بھی بالوضاحت بتا دیا گیا ہے کہ ہر فرد خدا کے حضور جواب دہ ہے کوئی جان کسی دوسرے کے اعمال بد کا بار نہیں اٹھائے گی لہذا کوئی ابدی گناہ طوق کی طرح اولاد آدم کے گلے میں پڑا ہوا نہیں - قرآن بتاتا ہے کہ ہر فرد کے روابط خود اپنی ذات سے کیا ہیں ، افراد معاشرہ سے کیا ہیں اور خدا وند تعالیٰ سے کیا ہیں ؟ اس بنیاد پر اسلامی معاشرہ استوار ہوتا ہے - وہ معاشرہ جس کی بنا خدا کی توحید پر ایمان ہے اور جو اصولاً ہر فرد سے تقاضا کرتا ہے کہ اس کے ذاتی اعمال میں بھی توحید ہو - اس کےسلوک میں تضاد و تفریق نہ ہو ، شخصیت منتشر نہ ہو - اسی طرح آدم کے اجتماعی رویے میں بھی توحید ہو ، تضاد و افتراق نہ ہو ، یہ احساس توحید ایک خاص طرح کا توازن اور تناسب پیدا کر دیتا ہے جس سے مرد مومن کا زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر بن جاتا ہے - ایک مخصوص طرز عمل وجود میں آ جاتا ہے - اس مخصوص کیفیت یا رنگ کی بدولت جہاں بھی ہوگا پہچان لیا جائے گا - اہل توحید کا توحیدی رویہ انھیں متحد کر دیتا ہے اور وہ کروڑوں سینوں کے با وصف یک دل ہوتے ہیں - اس بات کو Maurice Gaudfroy Demumbynes نے اپنے الفاظ میں اس طرح دھرایا ہے :

"اگرچہ باختلاف زمان و مکان مسلمان اقوام میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں مگر ان کے مشترک اعمال و رسوم اور افعال اور آداب نے انھیں بد ستور حیات تازہ دی ہوئی ہے" - [1]

اور آگے چل کر یہی مصنف رقم طراز ہے :

---

1. Muslim Institutions P - 159

"مسلم معاشروں میں گو دولت کی رعایت سے یا منصب کے باعث طبقات پیدا ہو گئے ہیں - اس کے باوصف برابری اور مساوات کا احساس موجود رہتا ہے جو بڑے حیرت ناک انداز میں ان کے مشترک رویے اور آہنگ میں جلوہ گر ہے"۔ ۱

حضرت علامہ اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں :

چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
اہل حق را حجت دعوی یکسیت
خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکسیت

(اے کلمۂ توحید کا ورد کرنے والے مرد موحد! پتہ بھی ہے ملت کسے کہتے ہیں؟ ملت ہے ہزاروں آنکھوں کے باوصف نظر کا ایک ہونا -

(اہل دل کی دلیل بھی ایک سی ہوتی ہے اور دعوی بھی، ہمارے خیمے جدا جدا نظر آتے ہیں مگر ہمارے دل ایک ہیں)

اس موضوع کے باب میں سی - ڈبلیو سمتھ کا قول بھی دلچسپی سے خالی نہیں، وہ لکھتے ہیں :

"زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو خواہ وہ کسی بھی موضوع سے متعلق تھا اسلامی رنگ میں رنگ دیا گیا، اور یہی وہ اسلامی ڈھانچہ ہے جس نے اسلامی معاشرے کو یک جہتی بھی عطا کی اور زور اور ولولہ بھی - اس وحدت آموز قوت (توحیدی قوت) کا مرکز وہ دینی ضابطہ اور آئین تھا جو اپنے طاقت ور اور صریح ولولے کے جلو میں ہر بات کو نظم و ترتیب سے نواز رہا تھا، عبادات سے لے کر حقوق ملکیت تک سب معاملات اس کے زیر اثر تھے - اسلامی آئین

Muslim Institutions P - 175 1

(فقہ) نے مسلمان معاشرے کو قرطبہ (ہسپانیہ) سے لے کر ملتان تک وحدت سے نواز رکھا تھا ۔ یہی نہیں بلکہ اس نے مسلمان فرد کو بھی (خود اس کی ذات میں) وحدت سے نواز رکھا تھا ۔ اس لیے اس ساری زندگی کو اس پاکیزہ سانچے نے عملاً منضبط اور منظم کرکے ایک بامعنی اور بھرپور کل بنا دیا تھا،، ۔ [1]

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ، جو معاشرہ توحید کی اساس پر استوار ہوگا اس معاشرے سے ہر باطل کو پرخاش ہوگی ۔ حق اور باطل میں تصادم بالکل طبعی حقیقت ہے ۔ کائنات میں فقط دو ملتیں ہیں ۔ ایک اسلام ، ایک کفر ، ان دونوں ملتوں کی باہمی چپقلش یا بالفاظ علامہ اقبال چراغ مصطفویؐ سے شرار بو لہبی کی ستیزہ کاری،، اس وقت سے جاری ہے جب سے وحی نازل ہونے لگی ، اللہ نے انبیاء کو بھیجنا شروع کیا اور اسلام آنے لگا اور پھر انسان کی درجہ بدرجہ عقلی اور ذہنی ترقی کے ساتھ وحی قدم بہ قدم آگے چلنے لگی تا آنکہ خدا وند کریم نے آدم کو عقل و ذہن کی وہ پختگی عطا کر دی جسے بلوغت کہتے ہیں ۔ جب یہ مرحلہ آ گیا تو کامل ترین مثال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور اسوہ حسنہ کی صورت میں بخشی دی ، حضور ہمہ نوعی اعتبار سے نمونہ اتم و اکمل ، حضور کے افعال ، اعمال اور اقوال اور احوال امت کے لیے سرچشمہ ہدایت ہیں ۔ اس قرآن اور سنت کے ہوتے مزید نہ کسی وحی کی ضرورت اور نہ کسی صاحب وحی کی ، بقول علامہ اقبال :

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

---

1. Islam in Modern History (1st Ed). Paperback P - 37

نوع انسان را پیام آخریں
حامل او رحمۃ العالمین

"وہ کتاب زندہ جس کا نام قرآن ہے ازلی اور ابدی حکمت کی مالک ہے وہ کتاب نوع انسان کے لیے آخری پیغام ہے اور جس ذات پر قرآن نازل ہوا اس ذات کو رحمۃ اَلْعَالَمِیْنَ کہا جاتا ہے"۔

اگر کتاب آخری کتاب ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ امت اسلامیہ بھی آخری امت ہے۔ لہذا پھر حضورؐ تمام جہانوں کے لیے ہیں۔ آپ کا اسوہ حسنہ بھی تمام جہانوں کے لیے ہے اور یہ امت بھی تمام جہانوں کے لیے ہے قرآن حکیم کا اعلان ہے۔ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"[1]

(سورہ ۳، آیت ۱۱۰)

اور اسی طرح دوسرے موقع پر فرمایا۔

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا"[2] (سورہ ۲، آیت ۱۴۳)

(اور اس طرح ہم نے تم لوگوں کو متوسط امت بنا دیا تاکہ تم اولاد آدم کے گواہ رہو اور رسول خدا تمہارے گواہ رہیں) اسلام، قرآن، رسول، امت نہ کسی خاص علاقے کے لیے ہے اور نہ کسی خاص نسل کے لیے حضور کا ارشاد ہے "الخلق عیال اللہ" (تمام اولاد آدم اللہ کا کنبہ ہے) سب ایک برادری ہے پھر اگر برادری سچ مچ برادری ہے تو کوئی کسی سے از روئے قانون اسلام بڑا نہیں، کسی کو خصوصی مراعات حاصل نہیں۔ کوئی ساقط الحقوق، کوئی بالائے قانون نہیں اور بقول ریوبن لیوی (Reuben Levy)

"سربراہ مملکت بھی قانون کا پابند تھا۔ اس کے لیے کوئی خصوصی رعایت نہ تھی"۔[3]

Social Sructure of Islam. (Cambridge) P - 295 1.

زندگی کے مسائل میں کسی کے لیے قومی ، نسلی ، اور مالی اعتبار سے یا معاشرے میں منصب اور اختیار کی رو سے کوئی اختصاص نہ تھا وہ مسائل تجارت سے متعلق تھے ، زراعت سے ، تعلیم سے ، صحت عامہ سے ، مزدوری سے ، خواہ جرم و سزا سے ، قانون اسلام کے رو برو سب برابر -

قرآن کو غور و تامل سے پڑھنا اور سمجھنا فقہ کہلاتا ہے ، اور جو شخص اس ضمن میں صاحب فضیلت و مقام ہو اسے فقیہ کہتے ہیں - اصطلاحاً قرآن و سنت کی روشنی میں حقوق و فرائض کا تعین کرنے والا ، آئین و دستور مرتب کرنے والا اور اس بارے میں دوسروں کی ھدایت کا بار اٹھانے والا معلم اور مفتی اور قاضی سب فقیہہ - اور ایک بات بالکل عیاں ہے کہ فرد کا ذاتی اخلاق اور ایک مخصوص مومنانہ رویہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قرآن اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم رگ و پے میں نہ اترے - حضور کا اپنا اخلاق فعال اور زندہ قرآن تھا ، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ کا اخلاق کیا تھا تو انھوں نے جواب دیا - كَانَ خُلُقُهُ الْقُرآنْ (آپ کا اخلاق عین قرآن تھا) -

علامہ اقبال نے قرآن کو ''کتاب زندہ،، اسی وجہسے قرار دیا ہے کہ وہ آدم کی زندگی پر اثر انداز ہوکر اسے بہتر سے بہتر آدم بناتا چلا جاتا ہے - یہ اثر ایک خاص زمانے کے بنو آدم تک محدود نہیں ، قرآن کو الی الابد یہ فریضہ سر انجام دینا ہے ، یعنی جملہ انقلابات و تحولات اور تطورات و تغیرات کے باوصف قرآن کو بنیادی اور اصولی راہیں سجھانا ہیں ، لہذا قدرتی بات ہے کہ فقہ جس کا اساسی اور اولین مصدر قرآن ہے مقفل نہیں ہو سکتی ، ھاں یہ ضرور ہے کہ وہ کسی بھی ارتقائی پیچیدگی یا اضطراب کے عالم میں قرآن سے تعلق توڑ نہیں سکتی ، حضرت علامہ اس باب

میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں :

"لیکن اس سلسلے میں غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطمح نظر ہے جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کے بجائے حرکت پر رہیں ۔ لہذا ظاہر کہ جس کتاب کا مطمح نظر ایسا ہوگا اس کی روش ارتقاء کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے ، البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے تو یہ کہ زندگی محض تعبیر ہی نہیں ، اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ انسان جب اپنی تخلیقی فعالیت سے لطف اندوز ہوتا اور اس کے ساتھ زندگی کے نئے نئے جلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اپنے انکشاف ذات سے آپ ہی بے چین ہو جاتا ہے ، لہذا اس ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا،، [1]

حضرت علامہ فقہا کی محنت و کاوش کی داد دیتے ہیں ۔ کہتے ہیں :

"جن حضرات نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے خوب جانتے ہیں کہ بلحاظ ایک نظام مدنیت اور سیاست اسلام نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کا تقریباً نصف حصہ ہمارے فقہا کی ذہانت اور فطانت کا مرہون منت ہے ۔ [2]

مگر فقہائے ماضی کو اس طرح داد دینے کے باوصف وہ یہ ماننے کو بالکل تیار نہیں کہ اب فقہ میں مزید ترقی ممکن نہیں ، چنانچہ سطور داد و تحسین کے ساتھ ہی کہتے ہیں :

"لیکن اس ساری جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود ہمارے نظامات فقہ بالآخر افراد ہی کی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہیں

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۲۵۷

۲- ایضاً ص ۲۵۹

اور اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر قانون کے نشو و نما کا خاتمہ ہو چکا ہے،،

پھر اسی ضمن میں چند سطور آگے چل کر فرمایا ۔

،،آئمہ مذاہب کا کیا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور تعبیرات حرف آخر ہیں ؟ ہرگز نہیں ۔ اندریں صورت مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعویٰ دار ہے کہ اسے اپنے تجربات علی ہذا زندگی کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیش نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سر نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک یہ کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو ۔ قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے ، یہ نہیں کہ اپنے لیے روک تصور کرے،، ۔ [۱]

بہر حال فقہی مسائل کا زیادہ تر تعلق معاشرے سے ہے بلکہ معاشروں سے ۔ دنیا روز بروز زمانی اعتبار سے سکڑ رہی ہے لہذا مکانی بعد بھی کم ہو رہا ہے ۔ گویا کوئی معاشرہ دوسرے معاشروں سے الگ تھلگ نہیں رہ گیا اور نہ رہ سکتا ہے ، بالفاظ دیگر یہ کہ فقہ اسلامی کا دائرہ وہاں وہاں تک اثر انداز ہونا چاہیے جہاں جہاں مسلمان کسی بھی حیثیت و اثر کا مالک ہے اس لیے کہ اب تجارت و تعلیم ، صلح و جنگ ، حریف و حلیف وغیرہ کی نوعیت کچھ سے کچھ ہوتی جا رہی ہے ۔ لمبے سفر میں جو کسی اور جگہ کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور کسی اور جگہ کے وقت پر ختم ہوتا ہے ، راستے میں طلوع و غروب کے وہ اوقات نہیں رہتے مثلاً روزہ دار اپنے گھر سے چلتا ہے اپنے مقامی وقت کے

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۲۶۰

حساب سے اور سورج کی ایک مخصوص منزل کے عالم میں مگر وہاں وہاں پہنچتا ہے جہاں اوقات بھی بدلتے ہیں اور طلوع و غروب کی منزلیں بھی کچھ کا کچھ منظر دکھاتی ہیں ۔ لہذا کوئی صورت وقت اور گھنٹوں کے اوسط سے مقرر ہو جانی چاہیے جیسے ان علاقوں میں ہوگا جہاں راتیں کئی کئی دنوں بلکہ ہفتوں کی ہیں ۔ یہ تو محض ایک ننھی سی مثال تھی ، غرض یہ کہ بڑھتی ہوئی بین الاقوامیت اور سکڑتی ہوئی کائنات میں پیچیدہ تر صورت اختیار کرنے والی معاملات و مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے اہل نظر فقہا کو تیار رہنا چاہیے ۔ حضرت علامہ کے آرا اوپر بیان ہو چکے ہیں ان کا ایمان یہ ہے کہ قرآن مصدر اول کی حیثیت سے پیش نظر رکھنے اور چراغ سنت کی روشنی میں دیکھنے اور قیاس کے وسیع اور جرأت بخش جوہر کا سہارا لینے سے ہر نئے مسئلے کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر قیاس کا معنیٰ ہی کیا ہے ؟

حضرت معاذؓ بن جبل کو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی حکومت سپرد فرمائی تو استفسار فرمایا : کہ تم امور و معاملات کے فیصلے کیونکر کرو گے ؟ عرض کیا : قرآن کی روشنی میں ، پھر استفسار ہوا اگر قرآن میں اپنا مطلب نہ پاؤ تو ؟ عرض کیا آپؐ کے عمل سے مدد لوں گا ، فرمایا : اگر میرے عمل میں بھی وہ معاملہ نہ ملے ؟ عرض کیا : پھر اپنی دانست سے کام لوں گا ، اس جواب پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار اطمینان و خوشنودی فرمایا ۔

واضح ہے کہ فقہ کا اثر بیشتر ان معاملات پر پڑتا ہے جن کا تعلق معاشرے سے ہے۔ انسان معاشرے کا ایک فرد ہے معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے ہٹ کر اور کٹ کر وہ کچھ بھی نہیں رہ جاتا ۔ اس لیے اس کی اپنی روش بھی معاشرے کے مطابق اثر پذیر اور اثر انداز ہوتی ہے ۔

تاہم اس کی اپنی ذات کی بھی ایک ''فقہ،، ہے وہ اس کی ذاتی ، روحانی اور عملی فقہ ہے، جسے ہم اخلاق کہتے ہیں ۔ معاشرتی اور انفرادی اخلاق کے مابین حد فاصل بظاہر کوئی نہیں ۔ اس لیے کہ فرد اگر محض اکیلا ہے تو اسے اخلاق کی ضرورت ہی نہیں ۔ اخلاق کی گنجائش ہی وہاں نمودار ہوتی ہے جہاں فرد کا دوسرے افراد سے رابطہ اور معاملہ شروع ہوتا ہے ، جہاں فرد کو اپنے اور دوسرے کے حقوق و فرائض سے واسطہ پڑتا ہے ۔ اس کی جواب دہی دو جگہ ہوتی ہے ، ایک معاشرے میں مروج قانون کی عدالت میں اور دوسری اللہ کے حضور میں ۔ اس کے قانونی جرائم بھی اکثر و بیشتر اللہ کے یہاں گناہ قرار پاتے ہیں ۔ اس لیے کہ اسلامی قانون قرآن اور سنت ہی پر مبنی ہے ۔ گویا ہر عدالتی ، انتظامی اور تجارتی و معاشی ضابطہ و قاعدہ جس اساس پر استوار ہے وہ دین ہے ، یہی باعث ہے کہ دینی اور قانونی امور میں بڑا قریبی رشتہ ہے ۔ [1]

ایک شخص جان بوجھ کر ٹریفک کے ضوابط کی خلاف ورزی کرتا ہے اور جرمانے یا قید کی سزا بھگتتا ہے ، اگر وہ مسلمان ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے جان بوجھ کر قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو گویا دوسروں کی پریشانی ، اذیت یا کم از کم گمراہی کا باعث بنا ہے ، یہ عمل خدا کی عدالت میں گناہ ہے خواہ اس کا درجہ کتنا ہی کمتر ہو ، مومن کی عدالت ایک نہیں ہوتی ۔ اس کا ظاہری اخلاق صحیح معنوں میں اخلاق جبھی بنتا ہے جب اس کا باطنی اخلاق بھی صحیح ہو ۔ بقول حضرت ابو سعید الخراز ۔

''کُلُ بَاطِنٍ یُخَالِفُہٗ ظَاہِرٌ فَھُوَ بَاطِلٌ،، ص ۲

(جس باطن کا ظاہر اس کی مخالفت کرے وہ باطن باطل ہے)

---

1 H. A. R. Gibb. Muhammadnism, (O. U. P 1961) P - 1

۲- عوارف المعارف ۔ عبدالقاہر بن عبداللہ ، ص ۵۰

ظاہری اور باطنی ہم آہنگی کے بغیر انسان بہ طیب خاطر بھلا اور اچھا آدمی نہیں بن سکتا، بھلائی اس کا مزاج اور طبیعت قرار نہیں پاتی۔ اس کا جرائم اور گناہوں کے ارتکاب سے اجتناب محض قانون کی گرفت کا خوف ہے، خدا کی خوشنودی اور ضمیر و قلب کا اطمینان ہرگز مقصود نہیں، لہذا ایسا شخص ہمیشہ محفوظ مواقع کی تلاش میں رہتا ہے اور پھر مواقع محفوظ میسر آجائیں تو چوکتا بھی نہیں، مصنوعی عفت و عظمت کا پیرہن مقامات ہوس کی کشش کے حضور میں ستر و حجاب ثابت نہیں ہوگا، یہ پیرہن بڑی آسانی سے تار تار ہو کر اتر جاتا ہے، لہذا اخلاق کی اصل اور اساس روح کی پاکیزگی ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام کسی پرائیوٹ اور پبلک لائف کے امتیاز و تفاوت کا قائل نہیں۔ کتب حدیث میں آیا ہے کہ حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ" ۱

(میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی روح اخلاق تربیت و تعلیم ہے اور آدمی کو بہر معنی بہتر آدمی بنانا ہے۔ حضرت عائشہؓ کا قول پہلے گزر چکا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حضور کا اخلاق سر بسر قرآن تھا۔ "کَانَ خُلُقُہٗ الْقُرْآنُ"۔ اب بات یوں بنی کہ مومن کے لئے بہترین نمونہ حضور کا اسوہ حسنہ ہے اور حضور کا اسوۂ حسنہ قرآن کے آئینے میں جھلک رہا ہے، گویا مومن جوں جوں حضور کا زیادہ اتباع کرتا ہے توں توں وہ قرآن بنتا چلا جاتا ہے۔ اگر وہ قرآنی اخلاق سے محروم ہو تو بظاہر کچھ بھی ہو اس کے ضمیر و بطون کے باب میں اطمینان بالعموم ناممکن ہو گا۔ بقول حضرت علامہ:

۱۔ فیض القدیر جلد دوم مکتبہ مصطفیٰ البابی، مصر ص ۹۱۵

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

یہ تو ظاہر و عیاں ہے کہ قرآن کسی خاص قوم یا نسل یا علاقے کے لئے نہیں آیا ، لہٰذا قرآنی آداب تربیت بھی بین الانسانی ہیں اور اس کا مقصد انسان کی انفرادی اور اجتماعی بھلائی ہے - چنانچہ ہر وہ علم ، ہر وہ رسم ، ہر وہ مسئلہ جو انسان کی بہتری کا باعث بنے وہ سب خیر اور اسلام ہے ، مگر کسوٹی اور میزان پھر قرآن اور سنت ہوں گے - ایک اخلاق وہ ہے جو معاشرے کی مصلحت کہا جاتا ہے - اگر وہ قرآن کے واضح ارشادات بلکہ قرآنی تعلیمات کی روح سے ٹکراتا ہے تو وہ کوئی مصلحت نہیں ، اس میں لازماً کوئی مضرت پوشیدہ ہے - مصلحت کسی نفع عاجل کا باعث ہو سکتی ہے یا دکھائی دے سکتی ہے مگر یقیناً آگے چل کے کسی بڑے اور پائدار نقصان کا باعث بن سکتی ہے ، لہٰذا ہر مزعومہ مصلحت کو بھی قرآن ہی کی روشنی میں دیکھنا ہوگا - [1]

انسان محض مادی وجود نہیں ، وہ روح و مادہ کی یکجائی کا مظہر جمیل ہے لہٰذا اس کی بدنی اور روحانی دونوں طرح کی پرورش اور تربیت ضروری ہے - اگر محض ایک ہی جانب پروان چڑھے تو آدم اس میزان و اعتدال سے محروم رہ جاتا ہے جس کے بغیر وہ صحیح معنوں میں اپنی تکمیل نہیں کر سکتا - روح اگر مادے یا یوں کہئے کہ بدن کے مطالبات کی غلام عاجز بن کر رہ جائے تو آدم کی منزل خود آگاہی اس سے ہمیشہ دور ہی رہے گی - خود آگاہی تو بیدارئی روح ہے جس کا مطلب ہے روح کا مغلوب و

۱- حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ ، از عباس محمود العقاد ، (بیروت) دارالکتاب العربی، ص ۱۳۱ ، ۱۳۲

محکوم نہ ہونا ، بلکہ اس کے بر عکس غالب و حاکم ہونا ۔

آج کے دور کا اجتماعی مزاج مادہ پرستی ہے ۔ آدم مٹی سے بنا لہٰذا مٹی ہی کے قرب میں اسے سہولت محسوس ہوتی ہے ۔ جسم کی راحت وہی مٹی کے قرب کی راحت ہے ۔ مٹی کی سطح سے روح کا اوپر کی طرف اٹھنا اور بدن کو تعاون کا عادی بنانا بڑا مشقت طلب مسئلہ ہے ۔ مقالے کے آغاز میں بالفاظ حضرت علامہ اور بحوالہٴ آیات الٰہی بتایا گیا ہے کہ آدم کو اوپر کی جانب جانا ہے، مشقت اٹھا کے جانا ہے، مادے کی برتری سے روح کی برتری تک کا سفر بڑا کٹھن مرحلہ ہے چنانچہ جب بھی آدم کو مادی راحت کی خواب آگیں کیفیت سے جگانے کی کوشش کی جائے وہ اسے اپنے حق میں عداوت جانتا ہے اور لڑ پڑتا ہے ۔ انفرادی زندگی میں بھی اس کا رویہ یہی ہے اور اجتماعی حیثیت میں بھی ۔ لہٰذا ایسی تمام عادتیں اور خصلتیں جو روح کو (بلکہ ساتھ ہی بدن کو بھی) کھا جائیں ترک کر دی جانی چاہئیں ۔ اس جانکاہ و تن فرسا کیفیت کے احاطے میں ہر بے اعتدالی آ جاتی ہے ۔ مگر نا آگاہ اور ناخود شناس آدم کہے گا یہی تو زندگی ہے ۔ بدنی زندگی کی مصلحتیں جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتیں ، ہر وہ منفعت جو مادی راحت کے وسائل مہیا کرے وہ ٹھیک ، حتٰی کہ خود حکومتیں اپنی اجتماعی مصلحتوں کے پیش نظر ناجائز اور آدم کش مادی ذرائع آمدنی کی پشت پناہی کرنے لگتی ہیں خواہ وہ آمدنی جوئے کی آمدنی ہو اور خواہ شراب کے کاروبار کی آمدنی ہو ، خواہ سود کی کمائی پر ٹیکس ہو ، وحی خداوندی پر مبنی ہر دین کی بنیادی تعلیم غلط انفرادی اور اجتماعی رویے سے ٹکراتی رہی ہے ۔ اسلام کی وہ صورت جو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کہلاتی ہے تمام سابقہ ادیان کی آخری ترقی یافتہ صورت ہے اور مادی مصالح کے باب میں اسلام کے رویے کی روح

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ قول معروف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی بنا کے بھیجا تھا نہ کہ ٹیکس کلکٹر۔

انسان کے لئے خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ کیا اس مسئلہ خیر و شر کا فیصلہ انسان خود اپنی دانش کے سہارے کر بھی سکتا ہے؟ یہ مسئلہ یوروپ والوں نے فلسفے کے کھاتے میں ڈال دیا یہی کچھ قدیم فلاسفہ نے کیا اور یہی جدید بھی کر رہے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ فلاسفہ کے بس کا روگ نہیں۔ انسان اپنا خالق خود نہیں، وہ اپنے امکانات اور اپنی حدود سے بخوبی آگاہ ہو ہی نہیں سکتا، خالق خدا ہے اور خالق ہی اپنی مخلوق کی ہمہ نوعی حیثیت کو بخوبی جانتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟) لہٰذا خیر اور شر کا مسئلہ احکام الٰہی کی روشنی میں حل ہونا چاہیئے۔ خدا کی ہدایت ہی اس باب میں معیار ہے۔ جن جن کاموں کے کرنے کا حکم ملا ہے وہ خیر ہیں اور جن جن امور سے منع کیا گیا وہ شر ہے۔ عباس محمود العقاد لکھتے ہیں:

"مکارم اخلاق کی بھر پور معیاری مقیاس کا مصدر وحی سماوی ہے جو آدمی کو ارضیت سے بلند کر دیتی ہے"[۱]

آدمی جتنا ارضیت سے قریب ہے اتنا انسانی اعتبار سے غیر ذی حیات ہے۔ قرآن بنو آدم کو مٹی سے اٹھا کر آسمان کی طرف لے جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ امر خدائے واحد پر ایمان و یقین کے بغیر عمل میں نہیں آسکتا۔ جب آدمی اپنے مقام کو پہچان لیتا ہے تو پھر اس پر عیاں ہو جاتا ہے کہ اس کی گزر گاہ کیا ہے، مرحلے کیا ہیں اور منزل کونسی ہے۔ پھر اسے غیر خدا کی محبت

۱۔ حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ، ص ۲۷۱

اپنا قیدی نہیں بنا سکتی اور خصوصاً مادی تقاضوں کی گرفت سے آزاد ہوتا چلا جاتا ہے - وہ اپنی کسی ملک کا مملوک نہیں ہوتا، وہ مالک ہوتا ہے اور مالک بھی ایسا جو جانتا ہو کہ اس کے جملہ مملکات اللہ کی امانت ہیں - وہ بوریا پر ہو تو فقیری و شاہی ہم معنی کلمات ہیں - خود آگاہ ہونا اور ماسوا اللہ کی محبت کا محکوم نہ ہونا عین روح اسلام ہے، علامہ اقبال نے کس خوبی سے شعر ذیل میں یہ مسئلہ بیان کر دیا ہے:

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

قرآنی اخلاق (اور ظاہر ہے کہ وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں) ارسطوئی اوسط کے لازماً پابند نہیں - خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا خود اپنی جگہ عمومی روشن اصول ہے، تاہم بعض شعبے ایسے ہیں جو اس اصول سے بے نیاز ہو کر باعث سرور و سرشاری بنتے ہیں، مثلاً ایثار یعنی دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا - یہ ایثار مالی اور جانی ہر طرح کے مواقع سے تعلق رکھتا ہے - سوال یہ ہے کہ ایثار کے جذبے کا اوسط کیا ہو گا؟ حق و صداقت کی پاسداری اور خدمت خلق کے جذبے کی سرمستی کو لیجئے، اس کا اوسط کیا ہو گا؟ حکم حق کی تعمیل میں شوق جہاد کا اوسط کیا ہوگا؟ حیا سر بسر خیر ہے، حیا کا اوسط کیا ہوگا؟ غرض بہت سے امور ہیں جن میں حسابی اوسط کا اصول نہیں چلتا - کسی بزرگ سے کہا گیا "لَاخَیْرَ فِی الْاِسْرَافِ" (اسراف میں کوئی خیر نہیں) انہوں نے جواب دیا "لَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ" (خیر میں کوئی اسراف نہیں) حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک بار جہاد کی تیاری کے موقع پر اپنا سارا گھر حضور نبیؐ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کر دیا تھا، حضرت صدیق اکبرؓ کے اس صدق کا اوسط کیا ہے؟ گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی اخلاق توازن

اور توافق کے مقتضی ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ جو جس مقام یا صورت حال کا تقاضا ہو وہ پورا ہونا چاہیئے اور بھرپور انداز میں ۔ مومن کی زندگی سر بسر اسی قرآنی توافق و توازن کی عملی تصویر و تفسیر ہونی چاہیئے ، بقول حضرت علامہ :

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان ، قیامت میں بھی میزان

میزان اور شے ہے ، اوسط اور چیز ہے ،

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مہلت حیات کم ہے ، کائنات کی عمر کے مقابل اس نازک وجود کی بقا تو جنبش مژہ کی نسبت بھی نہیں رکھتی ، پھر تربیت اور تعلیم اور آدمیت کے اکتساب کا مطلب کیا ؟ اگرحیات سچ مچ فانی ہے ، آدمی مٹی کا پتلا ہے اور اسے مٹی ہی میں مل جانا ہے تو پھر ان لمبے جھگڑوں میں پڑنے سے حاصل ؟ زندگی آئین کی پابندی میں گزرے یا وحشت کے انداز میں گزرے ، گزر ہی جائے گی ۔

کیا حیات آدم واقعی فانی و مہمل ہے ؟ یہ بات وہ ہے کہ دل آدم میں ہر دم کھٹکتی ہے ۔ اسی کے ساتھ اتنی ہی پر خلش یہ الجھن ہے کہ آیا آدمی مرنے کے بعد سچ مچ زندہ ہو جائے گا ؟ قرآن نے بار ہا تلقین کی ہے کہ بنو آدم ذمہ دار مخلوق ہیں اور انہیں اپنے اعمال خیر و شر کی جزا و سزا کے لئے بحضور خدا آنا ہے ، نیز یہ کہ ہر ایک کو اپنا اپنا اعمال نامہ لے کر اکیلے اکیلے حاضر ہونا ہے ۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ زندگی اس ظاہری موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی ، جیسا کہ پہلے اشارہ ہوچکا ہے قرآن زندگی کے تسلسل پر روشنی ڈالتا ہے اور زندگی کا تسلسل روحانی ہے ۔ بقول حضرت علامہ :

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے

اسی طرح حضرت علامہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

مگر انسان دوبارہ کس طرح زندہ ہو گا؟ قرآن حکیم نے مردہ زمین کی مثال سے سمجھایا ہے جو بارش کی بدولت دوبارہ جان دار بن جاتی ہے اور اس میں نمو کا جوہر پھر اپنا کمال دکھانے لگتا ہے۔

"فَانْظُرْ اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَتِ اللّٰہِ کَیْفَ یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ۭ اِنَّ ذٰلِکَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰی،، (سورہ ۳۰، آیت ۵۰)

(ذرا اللہ کی رحمت کے آثار دیکھو کہ وہ مردہ زمین کو کس طرح زندہ کرتا ہے، بے شک مردہ انسانوں کو زندہ کرنے والا بھی وہی ہے)

تاہم انسان پریشان ہوجاتا ہے کہ جب اس کا وجود چورہ چورہ ہوجائے گا، ہڈیاں ریزہ ریزہ ہوکر خاک میں مل جائیں گی، تو پھر وہ کیسے اکھٹی ہوں گی، اس کا جواب قرآن حکیم اس طرح دیتا ہے

"قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ،، (سورہ ۳٦، آیت ۷۹)

(وہ (آدمی) کہتا ہے کہ ہڈیوں کو در ایں حالیکہ وہ چورہ چورہ ہو چکی ہوں گی، کون زندہ کرے گا؟ تو (اے رسولؐ) کہہ دیں کہ وہی جس نے پہلی بار (عدم سے) خلق کیا تھا)

وہ خدا جس نے آدم کو عدم سے خلق کیا، اس عالم میں کہ وہ کچھ نہ تھا۔ کیا وہ آدم کے بکھرے ہوئے ذرات کو اکھٹا نہیں کر سکتا؟ بہر حال جو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے وہ مردے کو بھی جلا سکتا ہے۔ اگر یوں دیکھیں تو قرآن، کتاب زندہ، عالم انسانیت کی شکست آرزو کا واحد علاج ہے۔ مٹ جانے اور ہلاک ہو جانے کا احساس بے یقینی کی پیداوار ہے،

اور حق یہ ہے کہ اس احساس نے اس دور کے مادہ پرست انسان اور وجودی فلسفے کے ہزیمت آموز شعبے کے صید زبوں اہل دانش کو زندگی کی بے معنویت کے شعور اذیت میں مبتلا کر دیا ہے - زندگی کی بے معنویت کا ایک نتیجہ فوری اور طویل المیعاد خود کشی ہے ، دوسرا عیاشی ، تیسرا آدم بیزاری اور آدم کشی لب لباب یہ ہے کہ عالم انسانیت احترام و مقام انسانیت کے شعور سے محروم ہو کر بے یقین کی لحد میں جیتے جی داخل ہو رہا ہے ، مگر وہ شخص جو قرآن پر یقین رکھتا ہو حضرت علامہ کی طرح ضرور نعرہ زن ہو گا :

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

(جان جو عطا کی گئی ہے واپس نہیں لی جائے گی ، آدم بے یقینی کے باعث مرا جا رہا ہے)

اور یہ یقین عطیہ ہے قرآن کا ، تحفہ ہے اسلام کا -

علامہ اقبال ـ بحضورِ قرآن

حضرت علامہ نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا تھا :

نسخہ ٔ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندہ تاویل نے

(یہ کتاب وہ ہے جس میں ممکنات زندگی کے اسرار بیان کئے گئے ہیں ، اس کتاب کے باعث ناپائدار کو پائداری حاصل ہو جاتی ہے اس کے الفاظ کی سچائی شک و شبہ سے بالا ہے , اس کتاب کا ایک لفظ بھی تحریف کا شکار نہیں ہوا ، اس کی آیات میں کوئی انہونی بات بیان نہیں جس کے معانی کی تاویل کرنی پڑے)

ہر اس شخص کے نزدیک قرآن دانش و حکمت کا سب سے بڑا اور لازوال سرچشمہ ہے جس کا اس امر پر یقین ـــ یقین کامل ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے ـــــ یہی حال خود حضرت علامہ کا ہے - جب انہوں نے فکری زندگی میں بلوغت حاصل کی ، انہیں احساس ہوا کہ اب وہ زندگی کے اسرار کو سمجھنے کے کسی حد تک اہل ہیں , تو ان کا دل بول اٹھا کہ وہ دانش جو قرآن کے سراجِ منیر سے فیض حاصل نہیں کرتی ناقص ہے اور اس لئے ناقص ہے کہ وہ محدود ذہن اور فانی وجود کی سوچ ہے ـــ اولاد آدم کی ہمہ جہتی فلاح فقط قرآنی ھدایت ہی کی مدد سے ممکن ہے - اسی کامل یقین کی بنا پر انہوں نے اسرارِ خودی میں بحضورِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم التجا پیش کی کہ میں جو کچھ امتِ محمدیہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں بلکہ جو کچھ پورے عالمِ انسانیت کی نذر کر رہا ہوں وہ قرآن ہی کی روشنی میں نذر کر رہا ہوں ، اگر میں کوئی ایسی حکمت ، ایسی دانش ، ایسی

فکر ، اور ایسا اصول پیش کروں جو قرآن کے مخالف ہو تو پھر میں ایک ایسا مجرم ہوں جسے قیامت کے روز بڑی سے بڑی سزا دی جانی چاہیے ۔ اور پھر خود ہی یہ بتا دیا کہ ان کے لیے اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ انہیں قیامت کے روز حضور اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور خواری اور رسوائی سے دوچار ہونا پڑے اور انہیں آپ[4] کے بوسۂ پا کی سعادت سے محروم رکھا جائے۔ یہ مفہوم ذیل کے اشعار میں بیان ہوا :

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآن مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصارو دہور
چشم تو بینندۂ ما فی الصّدور
خشک گرداں بادہ در انگور من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

یہ التجا اور اعلان ۱۹۱۶ء کا ہے ، اس وقت ان کی عمر ۳۸ ، ۳۹ برس تھی ۔ ــــ گویا ۱۹۱۶ء سے علامہ کی اس شاعری کو جسے انہوں نے حکمت و دانش کا پیراہن پہنا کر امت مسلمہ کی خدمت میں پیش کیا قرآنی ہدایت اور قرآنی نور کے حوالے سے دیکھنا چاہیے ۔

گویا اب وہ شعوری طور پر قرآنی صراط مستقیم پر گامزن ہو چکے تھے ــ وہ اپنی اس بدلی ہوئی روش کی تائید و تاکید "زبورِ عجم" میں بھی کرتے ہیں "زبور عجم" ۱۹۲۷ء میں چھپی تھی، مطلب یہ کہ اس وقت تک حکمتِ قرآنی کے حوالے سے سوچتے انہیں تقریباً بارہ برس ہو گئے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے "زبور عجم" میں وضاحت کر دی کہ وہ کوئی عام شاعر نہیں جسے قوافی مضمون

سجھاتے اور ہر وادی خیال کی سیر کراتے ہیں -- ہر وہ شخص جو ایسی بات ان کے بارے میں سوچے ناکارہ شخص ہے - حضرت علامہ کا دعویٰ ہے کہ وہی داستان سنا رہے ہیں جو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے سنائی تھی ، چنانچہ اب وہ قاصد ، رقیب ، کوچہ محبوب اور دربان کے خیالی مضامین سے کنارہ کش ہو چکے ہیں :

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثال شاعران افسانہ بستم
نہ بینی خیرازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست
بہ جبریل امیں ہمداستانم
رقیب و قاصد و دربان ندانم

(تم یہ گمان نہ کرو کہ میں بھی ان فرض کار افراد میں سے ہوں جو نہ پیئیں اور مستی کا اظہار کرتے پھریں ، یہ گمان نہ کرو کہ میں بھی پیشہ ور شاعروں کی طرح بے بنیاد قصے اختراع کرتا رہتا ہوں - تم اس مرد کم نصیب و کم سواد میں بھلائی کے آثار نہیں دیکھو گے جو مجھ پر روائتی انداز کا شاعر ہونے کی تہمت لگاتا ہے میں تو حضرت جبرائیل کا ہم داستاں ہوں ، میں رقیب ، قاصد ، درباں وغیرہ (گھسے پٹے مضمون) سے سروکار نہیں رکھتا)-

ظاہر ہے کہ جو داستاں حضرت جبریل علیہ السلام نے سنائی تھی وہ وحی تھی ، وہ قرآن تھا -

قرآن صرف معناً وحی ہوا یا لفظاً بھی :

ایک سوال اہل فلسفہ و کلام کو خواہ وہ مسلم تھے خواہ غیر مسلم ، ہر دور میں پریشان کرتا رہا کہ وہ وحی جو کتب آسمانی میں مرقوم ہے آیا از روئے مفہوم و معنی وحی ہے یا لفظاً بھی

وحی ہے ۔ آیا صرف مضمون ہی رسولوں[۴] کے دل میں ڈالا جاتا رہا یا الفاظ بھی اوپر ہی سے آتے تھے ،؟ خود قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا ، حضرت جبریل امین کی وساطت سے نازل ہوا , حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل ہوا ، اور بڑی فصیح اور واضح عربی زبان میں نازل ہوا تاکہ لوگوں کو بخوبی متنبہ اور آگاہ کیا جا سکے ۔ قرآن حکیم کے الفاظ یہ ہیں :

”وَ اِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۝
عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ۝

(سورہ ۲۶ ، آیت ۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۱۹۴)

بلکہ سب سے پہلی وحی کا سب سے پہلا لفظ ہی شاہد ہے کہ وحی لفظاً بھی تھی ، محض مفہوماً اور مضموناً نہ تھی ، اس لیے کہ پہلا لفظ ہی ”اقرأ“ ہے ۔ جس سے واضح ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اس کے ضمن میں آپ کو پڑھنے یا یوں کہہ لیجئیے کہ اپنی زبان سے بولنے کی ہدایت کی جا رہی ہے ۔ جو کچھ اوپر سے آیا تھا اگر وہ لفظوں میں نہ تھا تو آپ کیا پڑھتے اور کیا دہراتے ؟

واضح ہے کہ کوئی معنی ذہن میں الفاظ کے بغیر نہیں ابھرتا ، اگر کوئی خیال سوجھتا ہے تو وہ الفاظ کے سہارے سوجھا ہے ۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ وہ خیال ذہن میں جن الفاظ کے ساتھ آیا ہو وہ اور ہوں اور جب معرض بیان کو پہنچے تو وہ خیال ہو بہو انہی الفاظ میں ادا نہ ہو جن الفاظ میں سوجھا تھا ۔۔۔مگر یہاں مسئلہ سوجھنے کا نہیں ، یہاں تو الفاظ پڑھائے اور یاد کرائے گئے ۔۔۔ قرآن کریم کے بارے میں حضرت علامہ کا موقف یہ تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر قرآن کے صرف معانی

ہی نہیں الفاظ بھی اترے تھے اور یہ وہی الفاظ ہیں جو ہمیں قرآن میں آج نظر آتے ہیں ۔ وہ الفاظ اللہ کا فرشتہ امین لایا تھا یہ ہرگز ممکن نہیں کہ قاصد نے بے الفاظ خیال لیا اور آگے بے الفاظ ہی منتقل کر دیا ، خالی بندے اور خدا کا مسئلہ ہوتا تو بات اور تھی ، مگر یہاں تیسرا وجود بھی ہے جو واسطہ ہے یعنی فرشتہ فقیر سید وحید الدین کہتے ہیں :

''ایک دفعہ ان (حضرت علامہ) کی طبیعت ذرا شگفتہ تھی ، یعنی باتیں کرنے کے موڈ میں تھے ۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب ! آپ شعر کیسے کہتے ہیں ؟ کہنے لگے تم نے بڑا دلچسپ موضوع چھیڑ دیا ہے لیکن پہلے ایک واقعہ سن لو ـــ ایک مرتبہ فارمن کرسچین کالج لاہور کا اجلاس ہو رہا تھا ... کالج کے پرنسپل لوکس نے مجھے اس میں دعوت شرکت دی ، اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا ۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے : چائے پی کر چلے نہ جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے ـــ ہم لوگ چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے پھر کہنے لگے کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے نزدیک پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قرآن کریم کا صرف مفہوم نازل ہوا تھا اور اسے اپنی زبان میں منتقل کرلیا تھا یا قرآن کی موجودہ عبارت بھی نازل ہوئی تھی ، گویا تمہارے عقیدے میں قرآن کے صرف مطالب الہامی ہیں یا تم اسکے الفاظ کو بھی الہامی سمجھتے ہو؟ میں نے کہا : ڈاکٹر صاحب میں تو قرآن کریم کے الفاظ کو بھی الہامی سمجھتا ہوں ، میرے نزدیک تو قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی ۔ ڈاکٹر لوکس یہ غیر متوقع جواب سن کر حیران

ہو گئے اور بڑے تعجب آمیز لہجے میں بولے مجھے حیرت ہے کہ تم ایسا ہوش‌مند کسی ثبوت کے بغیر اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قرآن کے الفاظ بھی الہامی ہیں ۔

میں نے کہا : ڈاکٹر صاحب ! جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مجھ پر پورا شعر اترتا ہے تو پھر نبی آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جنہیں خدا نے دنیا کی رشد وہدایت کے لیے بھیجا تھا قرآن کریم کی پوری عبارت کیوں نازل نہیں ہو سکتی؟ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ ڈاکٹر لوکس کو میں نے اس استدلال سے لا جواب کر دیا،،[1]

اس ضمن میں ایک واقعہ عرض کرتا چلوں ، جس طرح علامہ سے ڈاکٹر لوکس صاحب نے یہ بات پوچھی تھی بالکل اسی طرح میرے ایک رفیق کار نے مجھ سے دریافت کیا تھا : قرآن کے الفاظ بھی وہی ہیں ؟ میں نے جواباً سوال کیا ”آپ کوئی مفہوم ، مضمون مطلب ، مقصد ذہن میں بلا الفاظ سوچ کر مجھے بتائیں ،، وہ خاموش ہو گئے ، چند لمحوں بعد فرمایا ”ہر مضمون الفاظ ہی کے ساتھ سوجھتا ہے ”میں نے عرض کیا،، اور خاص طور پر وہی مضمون اگر آگے کسی اور کے یہاں منتقل کرنا ہو اور اسے پھر اور آگے کسی کے یہاں پہنچانا ہو ، ہو بہو پوری دیانت کے ساتھ ، تو پھر ؟ —— سیدھی سی بات ہے ، وحی کو مانیے یا نہ مانیے ، اگر مانتے ہیں تو پھر اتنے بٹہ اتنے نہ چلے گا ——،، میری اس وضاحتی تاکید پر پروفیسر صاحب ہنس دئیے ، مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ۔بے یقینی کی ہنسی تھی ۔

یہاں پروفیسر فلپ ہٹی (جناب ڈاکٹر ایس اے رحمان کا ارشاد ہے کہ انہوں نے ہٹی صاحب کو عربی حروف میں اپنا نام حتی لکھتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے) کے چند الفاظ کا

۱- روزگار فقیر ، ایڈیشن، فروری ۱۹۵۰ء ، ص ۵۶ ، ۵۷ ، ۵۸

اندراج بجا معلوم ہوتا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

"بائبل، جیسا کہ خود اس لفظ سے ظاہر ہے ، ایک کتب خانہ ہے وہ مختلف زبانوں میں لکھی گئی ، مختلف جگہوں میں لکھی گئی اور مختلف اوقات میں لکھی گئی ، اس تحریر کا عرصہ کوئی ساڑھے آٹھ سو سال کو محیط ہے مگر قرآن ایک شخص نے پیش کیا ۔ چند سالوں میں ، اور وہ شخص ایک ایک علاقے میں رہ رہا تھا ، بائبل القا کی گئی (Inspired) تھی ، قرآن املا کرایا گیا تھا (Dictated) ۔ قرآن کے کسی بھی اقتباس کو یوں کہہ کر پیش کیا جا سکتا ہے کہ "کہا اللہ تعالیٰ نے" ۔۔۔ بائبل کے متن پر ادارتی اور ترمیمی مشق بھی عمل میں آتی رہی ہے ، قرآن کے ضمن میں ایسا نہیں ہوا" [1]

قرآن کے الفاظ ، نور ، برکت اور شفا

قرآن کریم کا ارشاد ہے "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ" (سورہ ۱۷ ، آیت ۸۲)

(اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہیں) ۔

"يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا" (سورہ ۴ ، آیت ۱۷۴)

(اے لوگو تمہارے پاس ایک واضح دلیل تمہارے پروردگار کی طرف سے آ چکی ہے اور ہم تمہارے لیے اک کھلا ہوا نور اتار چکے ہیں) ۔

اگر قرآن حکیم کا محض مفہوم ہی نہیں ، لفظ بھی وحی ہیں تو پھر قرآن فقط معناً ہی نور و برکت اور شفا و رحمت نہیں لفظاً بھی ہے ۔ قرآن کے معانی ہی دلوں کی میل ، تاریکی اور

1 Islam a Way of Life, Oxford University Press, 1970, P, 27

بیماری دور نہیں کرتے ، خود الفاظ میں بھی ایسی مبارک اور نوری تاثیر ہے کہ الفاظ مفہوم سے بالا بالا بھی اپنا اثر دکھاتے اور فیض عطا کر جاتے ہیں ، بشرطیکہ فطرت صالح ہو اور دیدہ دانستہ حق کو جھٹلانے کا لپکا اور لٹکا لاحق نہ ہو - نیت کی کجی اور ہٹ دھرمی نے اندھا نہ کر رکھا ہو ، ہوس حاوی نہ ہو چنانچہ ،، ''ارمغان حجاز،، میں حضرت علامہ نے دختران ملت کوخطاب کرتے ہوئے اس حقیقت پر حضرت عمرؓ بن الخطاب کے واقعہ قبول اسلام کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے ، تاریخ گواہ ہے اور حدیث و رجال شاہد ہیں کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کفر کے عالم میں اس نیت کے ساتھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جا رہے تھے کہ جا کے آپ کا کام تمام کر دیں گے ، مگر راستے میں انہیں بتا دیا گیا کہ ان کی اپنی ہمشیرہ بھی اسلام قبول کر چکی ہیں لہذا انہیں پہلے گھر کی خبر لینی چاہیے ، چنانچہ وہ ہمشیرہ سے نمٹنے کے لیے لوٹ گئے - مگر وہاں ہمشیرہ کی زبان سے قرآن کے کلمات سنے تو ان کا دل جو پتھر تھا موم ہو گیا - ابھی کلمہ تو پڑھا نہ تھا ، قرآن کی حقانیت پر ایمان نہ لائے تھے ، اس عقیدے کے بھی مالک نہ تھے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے ، وہ تو الفاظ کے سوز اور اسلوب بیان ہی پر مٹے ، اور پھر بے تابی کے ساتھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں جا گرے - عمر بن الخطاب ، کتاب حکیم کے الفاظ ہی سن کر مان گئے کہ یہ کوئی عام قسم کی کتاب نہیں - یہ کوئی اور ہی شے ہے :

ز شام ما بروں آور سحر را
بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قراءت او
دگر گوں کرد تقدیر عمرؓ را

(ہماری شام میں سے سویرا نکال لاؤ ، اس لیے ضروری ہے کہ

اہل دانش و نظر کو پھر قرآن کی جانب بلاؤ
(تجھے معلوم نہیں کہ تیری قرأت کے سوز نے حضرت
عمرؓ کی تقدیر پلٹ کر رکھ دی تھی)

تقدیر عمرؓ قرآن کے الفاظ ہی کے سوز کی بدولت کچھ سے کچھ ہو گئی ۔ حضور اکرمؐ کے قتل کا ارادہ رکھنے والا شخص آپؐ کے جلیل ترین اصحاب میں شمار کئے جانے کا فخر حاصل کرے ، اونٹوں کی نگہبانی کرنے والا شخص خلیفۂ رسولؐ بنے ، امیرالمونین کہلائے اور دنیا کے لیے اجتماعی اخوت ، عدل گستری کفالت عامہ اور حسین انتظام کی روشن ترین مثال چھوڑ جائے ۔

قرآن کریم کے الفاظ کی فوری تاثیر کے ضمن میں حضرت علامہ کے یقین محکم کی تفسیر ذیل کا ایک واقعہ بھی پیش کرتا ہے ۔ یہ واقعہ رشید احمد صدیقی مرحوم کے مضمون سر اقبال مرحوم مشمولہ ''گنجہائے گرا نمایہ'' سے نقل کیا جاتا ہے صدیقی صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

''مرحوم کو سید راس مسعود سے بڑی شیفتگی تھی ، اسی طرح سرراس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا ۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر موصوفہ ڈاکٹر صاحب کی صحت اور آرام کا خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کرا دیا جو ہر صبح آدھا گھنٹہ لیڈی مسعود کو قرآن پاک سنائے ، یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی مسعود کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی ، مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچے پر اس کا اثر بہت اچھا پڑے گا ''[1]

---

۱. گنجہائے گرانمایہ ، تھری فرینڈز پبلشرز ، اردو بازار ، راولپنڈی ، ص ۴

گویا حضرت علامہ کے نزدیک قرآن حکیم جہاں کتاب ہدایت ہونے کے باعث کتاب العمل ہے اور عمل کا تقاضا کرتا ہے وہاں وہ اپنے پورے پیکر کی رو سے نور ، شفا اور رحمت و برکت بھی ہے - وہ پیکر لفظی ہے ، لہذا حسب مقدور بے علم بھی فائدہ حاصل کرتے رہتے ہیں - کسی بزرگ سے یہی سوال کیا گیا تھا کہ مطالعۂ قرآن ناظرہ یعنی فہم مطالب کے بغیر بھی کوئی فائدہ دیتا ہے یا نہیں ، تو اس بزرگ نے جواب دیا تھا کہ اگر آپ کوئی دوا کھائیں جس کے اجزاء کا اور ان اجزا کے خواص کا آپ کو علم نہ ہو تو کیا دوا اثر نہیں کرتی ؟

''دختران ملت،، کو خطاب کرتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا تھا ــ ''بہ قرآن باز خواں اہل نظر را،، ''اہل نظر،، کی شرط محض شاعرانہ ضرورت یا قافیے کی مجبوری نہ تھی - اللہ کی نشانیوں کو اہل نظر ہی پہچانتے ہیں اور جب ان تک شمع ہدایت پہنچتی ہے تو وہ آنکھیں بند نہیں کر لیتے - جن کا دل روشن ہو ان کی بصارت بڑی بابصیرت ہوتی ہے ، بعض اوقات ایسے افراد ان پڑھ ہونے کے باوصف وہ کچھ جانتے اور دیکھتے ہیں کہ ظاہری روشن آنکھوں کے مالک دیکھتے رہ جاتے ہیں - یہاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں سے چند کلمات کا اندراج بے محل نہ ہو گا -

ایک روز حضرت خواجہ نظام الدین نے حسن افغانی کا ذکر فرمایا - حسن افغانی کا شمار حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے مریدوں میں ہوتا ہے - اور حضرت زکریا کا دور حضرت نظام الدین اولیاء کے دور سے متصل تھا اس لیے کہ وہ حضرت خواجہ کے پیرو مرشد شیخ الاسلام فرید الدین مسعود گنج شکر کے معاصر بھی تھے اور رفیق بھی ، اس لیے حسن افغانی کا واقعہ گویا حضرت خواجہ کے لیے تقریباً ہم عصر واقعہ ہے - ہاں تو حضرت خواجہ نے حسن

افغانیؒ کے باب میں فرمایا کہ وہ امی محض تھے ، مگر لوگ ان کے پاس آتے اور کاغذوں پر تختیوں پر چند سطور تحریر کرتے ، نظم بھی ، نثر بھی ، کچھ عربی ، کچھ فارسی ، طرح طرح کی ان سطور میں کوئی سطر قرآنی آیات میں سے بھی لکھ دیتے اور پھر حسن افغانی سے پوچھتے ان سطور میں قرآن کہاں ہے ؟ اور حسن اشار سے بتا دیتے کہ یہ ہے ، جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم نے قر پڑھا ہی نہیں تو کیسے جان لیا کہ یہ قرآن کی آیت ہے ، حسن افغانی جواب دیتے کہ جو نور اس سطر میں نظر آتا ہے وہ دوسری سطور میں نظر نہیں آتا [۱]

وہی تختی یا کاغذ ، وہی قلم ، وہی روشنائی اور وہی خط ، پھر شناخت کرنے والا ''ان پڑھ'' مگر اشارہ کرے بالکل صحیح کہ یہ تحریر قرآن ہے ، اس لیے کہ جو نور اس میں ہے وہ دوسری تحریروں میں نہیں ہے ۔ کیا مرئی اشیاء کے بارے میں ضیاء نظر کے طول موجی اور طیف (Spectrum) تناسبات رنگ کے حقائق سے آگاہ لوگ قرآنی آیات میں پوشیدہ نور کو دیکھ لینے والی کسی آنکھ یا اس آنکھ کے پیچھے کار فرما کسی آنکھ کے بارے میں بھی کچھ جانتے ہیں ؟ ـــــ جلد بازی میں ان حقائق کی تردید نہ کر دیجئیے ، اس سے یہ نتیجہ اخذ کیجئے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی لطافتیں اور نفاستیں جمع کر رکھی ہیں ۔ اس کے روحانی اور معنوی امکانات بے حدود ہیں ۔ ابھی تک خارجی حسیات ہی کے جغرافیے سمجھ میں نہیں آ رہے ، داخلی حسیات کے دسترس میں آنے کا شاید ابھی وقت نہیں آیا ، ابھی دیر لگے گی ، ہاں اتنی سی بات ضرور توجہ طلب ہے کہ داخلی حسیات کے ماہرین نے بھی کچھ کہا ہے ، وہ ماہرین جو حسن کردار کا نمونہ

۱۔ فوائد الفواد ، (فارسی) شائع کردہ محکمہ اوقاف ، لاہور ص ۱۵، ۱۶

تھے ، جو آداب و اخلاق کی روشن مثال تھے ، جو بادیانت تھے ، اور جو قرآن سے ہم آہنگ تھے ، وہ متقی لوگ تھے ۔ ان کے لیے یہ حسیات ، یہ اندرونی باریکیاں ، لطافتیں اور نزاکتیں اتنی ہی حقیقی تھیں اور اتنی ہی قابل اعتماد تھیں جتنی آج طبعیاتی ، کیمیائی ، نفسیاتی معملوں میں تجربات کی زد میں آنے والے حقائق بلکہ اندرونی حسیات کی عطا کردہ آگاہی بیرونی حسیات کی بخشش سے زیادہ وسیع ، زیادہ دور رس اور زیادہ قابل اعتماد ہے ۔ اللہ نے آدم کے پتلے کے اندر اپنی روح پھونکی اور اللہ زمینوں آسمانوں کا نور ہے ، ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد آدم روح کو اپنے مادی وجود پر غالب اور حاوی کر لیتا ہے تو اس کے لیے خارجی مادی وجود یا فاصلے کوئی حارج اور حائل حقیقت نہیں رہ جاتے ۔ حضرت علامہ نے نہ جانے کس روحانی کیفیت کے نورانی لمحوں میں کہا تھا :

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسمہائے پنہانی

حضرت علامہ اپنے الفاظ میں اس امر کی وضاحت یوں فرماتے ہیں :

''قلب کو ایک طرح کا وجدان یا ''اندرونی بصیرت،، کہئے ، جس کی پرورش مولانا روم کے دلکش الفاظ میں نور آفتاب سے ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہم حقیقت مطلقہ کے ان پہلوؤں سے اتصال پیدا کر لیتے ہیں جو ادراک بالحواس سے ماورا ہیں ۔ قرآن مجید کے نزدیک قلب کو قوت دید حاصل ہے ، اور اس کی اطلاعات ، بشرطیکہ ان کی تعبیر صحت کے ساتھ کی جائے، کبھی غلط نہیں ہوتیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی پر اسرار قوت ہے ، اسے دراصل حقیقت

مطلقہ تک پہنچنے کا وہ طریق ٹھہرانا چاہئے جس میں باعتبار عضویات ، حواس کا مطلق دخل نہیں ہوتا ، بایں ہمہ اس طرح حصول علم کا جو ذریعہ پیدا ہوتا ہے ایسا ہی قابل اعتماد ہو گا جیسے کسی دوسرے مشاھدے سے،،[۱]

قرآن وحدت آدم کا حبل متین اور رشتۂ استوار

جب کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے تو اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے استوار ہو جاتا ہے ، قرآن ایک ایسا رابطہ اور ایک رسی بن جاتا ہے جس کی ایک جانب خدا ہوتا اور دوسری جانب بندہ ، اور اگر ساتھ ہی قرآن کی قرات کرنے والے کو یہ بھی خیال رہے کہ یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت جبریلؑ نے ادا کئے ، اور جو حضرت جبریلؑ کو خود خدا نے عطا کئے تھے نیز یہ کہ یہ وہی الفاظ ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے جن کو اسی طرح آئمہ و صدیقین و شہدا و اولیاء و اتقیا نے ادا کیا ، جن کو آج تک اربوں زبانیں پڑھ چکی ہیں ، جس طرح میں خود پڑھ رہا ہوں ، تو مطالعہ قرآن کی لذت میں کچھ اور ہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر ساتھ ہی یہ بھی احساس بیدار رہے کہ آوازیں بھی مادی ذرات کی طرح ناقابل تحلیل ہیں اور مٹتی نہیں تونشے میں اور بھی گداز واقع ہو جاتا ہے ، اس نشے کو فقط محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بیان نہیں کیا جا سکتا ، کہ میری آواز حضرت جبریلؑ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کے ہمراہ اصحاب رسول ، آئمہ امت ، صدیقین و شہدا و اولیاء کی آواز میں شامل ہو رہی ہے ، یہ مثال ان ذرات کی سی ہے جو سورج کی کرن کے سامنے آ جائیں اور ان کے لیے کرن وہ رشتہ اور تاگا بن جائے کہ سورج کے ساتھ ان کا ایک تعلق قائم کر دے۔

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۲۳

اس طرح قرآن جو اللہ کی رسی ہے پوری امت اسلامیہ کے لیے (اور یہ امت نسلی لسانی اور علاقائی گروہ کا نام نہیں - یہ امت وحدت آدم کی علامت ہے) ظاہراً اور باطناً دونوں طرح رشتہ اتحاد بن جاتا ہے ، قرآن کو مضبوطی سے پکڑ لینے کا مطلب یہ ہوا کہ موتی ایک ہی رشتے میں پرو دیئے گئے ، اور اس رشتے میں پرو دیئے گئے جس کی ایک طرف بندہ ہے اور دوسری طرف خدا ، — جو اس رشتے میں پرویا نہ جا سکا وہ کہاں کا رہا - وہ تو کہیں کا نہ رہا - اور ہاں اس رشتے میں پروئے جانے کے بعد ظاہری جملہ امتیازات ختم ہوگئے ، گوری ، کالی ، بھوری ، اور زرد نسل کے لوگ ، شرقی و غربی ، شمالی و جنوبی ، امیر و غریب ، دارا و نادار سب ایک ہوگئے ، کسی کو کسی پر فوقیت نہ رہی ، حضرت ابو سعید الخدری رض سے مروی ہے کہ حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"کتاب اللہ ھو حبل الممدود من السماء الی الارض" ۱

(اللہ کی کتاب ہی اللہ کی وہ مضبوط رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے) -

اسی مضمون کو حضرت علامہ اقبال نے ذیل میں بیان کیا ہے۔ وہ قرآن کریم کے بارے میں کہتے ہیں :

ماھمہ خاک و دل آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست
چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو

(ہم سر تا سر مٹی ہیں ، دل زندہ و آگاہ قرآن ہے ، یہ اللہ کی رسی ہے ، اسے مضبوطی سے تھام لو - اس رشتے میں اپنے آپ کو موتی کی طرح پرو لو ورنہ ذرات خاک کی طرح آوارہ و پریشان ہو جاؤ گے) -

---

۱- فیض القدیر ، مکتبہ مصطفیٰ البابی جلد دوم ، مصر ص ۸۳

مگر ''اعتصمامش کن،، کا مطلب ہے مضبوطی سے پکڑو اور پکڑے رہو، یہ نہیں کہ مطالعہ کرتے وقت ہو ایک رابطہ قائم ہو اسی کو کافی جان لو ، ادھر تہ کرکے طاق میں رکھو اور ادھر رابطہ ختم ہو جائے قرآن کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کا مطلب ہے کہ قرآن دل میں اتر جائے ، قرآن لائحہ زندگی بن جائے بلکہ خود زندگی ، ہر جائزہ قرآن کی روشنی میں کارفرما ہو ، ہر فیصلہ قرآن کی روشنی میں صادر ہو ، حیات انفرادی اور حیات اجتماعی میں حقوق و فرائض کا تعین اور انجام دہی قرآن ہی کی روشنی میں جلوہ گر ہو ، غرض قرآن علم ہو ، قرآن عمل ہو ،قرآن نظر ہو، قرآن دل ہو، قرآن ایمان ہو ، قرآن ہی جان ہو ، اگر عالم یہ ہو تو واضح رہے کہ پھر جملہ حاملین قرآن ایک ہی طرح سوچیں گے ، ایک ہی طرح کا اسلوب زندگی اختیار کریں گے ان کی پسند و نا پسند ایک ہی جیسی ہو گی - اور وہ باقی اولاد آدم سے از روئے رویہ و سلوک ممیز و ممتاز ہوں گے ، ہر فرد نظری اور عملی استقامت کے کے باعث ''توحید،، کا مظہر ہوگا اور اجتماعی زندگی بھی ''توحید،، کا مظہر ہوگی ، اور یہی ہے مفہوم حضرت علامہ کے شعر کا -

یک شود توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن

قرآن دل پر نازل ہوتا رہنا چاہئے

حس قوی کے علم سے تحلیل و تجزیہ کرکے اصول اخذ کرنا عقل کا کام ہے مگر اس اصول پر قائم ہو جانا ، ہر طرح کی قربانی کر گزرنا ، جان تک دے دینا ، یہ مرحلہ عقل کی قلمرو سے باہر ہے ، یہ مرحلہ ایمان کا مرحلہ ہے اور یہ قلب کی ہدایت اور فیصلے کے بغیر نہ حاصل ہوتا ہے اور نہ طے ہو پاتا ہے ، ایمان ہی کی اگلی منزل یقین اور عشق ہے عقل تو معلومات حاصل کرنے تک اور تجزیہ و تحلیل تک رہ گئی ، معلومات کا جذبہ بننے ،

جز و جان بننے ، ایمان اور پھر ایقان بننے اور جنوں بننے کی ساری کیفیتیں آگے کی حالتیں ہیں - ان کا کارخانہ دماغ نہیں ، ان کا کاشانہ دل بن جاتا ہے ، حضرت علامہ کہتے ہیں :

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں

قرآن حکیم کا ارشاد ہے

"و ربطنا علی قلوبھم اذ قاموا فقالوا ربُّنا رَبُّ السمٰوٰت و الارض،، (سورہ ۱۸ آیت ۱۴)

(اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے ، جب وہ پختہ عزم ہوگئے تو بولے ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا پروردگار ہے)

اس طرح واضح ہوا کہ جسے ایمان لانا کہتے ہیں وہ محض اقرار لسانی نہیں ایمان تو اس وقت بنا جب دل میں راسخ ہوا بقول حضرت علامہ :

زباں سے کہہ بھی دیا "لا الہ" تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

قرآن کریم کا ارشاد ہے

"ولکن اللہ حبب الیکم الایمان و زینہ فی قلوبکم،،
(سورہ ۴۹ آیت ۷) (بلاشبہ اللہ نے تمہارے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمہارے دلوں میں سجا دیا)

ظاہر ہے کہ ایمان کا دل میں اترنا اور دل میں سج جانا وہ امر ہے جو عقلیین کی گرفت سے آزاد ہے ، خدا ، فرشتہ ، وحی ، رسالت اور رسول عقل کے بس کی بات نہیں - اللہ کی طرف سے آنے والے نور کو اسی نور کی مدد سے پہچانا جا سکتا ہے جو "نفختُ فیہ من رُوحی،، کی بدولت انسان کے اندر موجود ہے اور اس کا مقام قلب ہے -

بقول حضرت علامہ :

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

وحی کا رابطہ اگر براہ راست قلب سے ہو تو بات سمجھ میں آگئی ورنہ الفاظ کی ایک نادر ترکیب سے زیادہ کچھ بھی نہیں - یہ ٹھیک ہے کہ خود وحی کا حکم یہ ہے کہ غور و فکر کرو ، عقل کو کام میں لاؤ ، شعور کی شمع جلاؤ ، مگر پہلے خود وحی پر ایمان باالغیب ہو تو بات بنے ، مطلب یہ کہ عقلی دلیلوں ، منطق کے اصولوں اور فلسفے کی باریکیوں سے ایمان نہیں سیکھا جا سکتا اکتساب عشق نہیں کیا جا سکتا ، جبھی تو حضرت علامہ نے فرمایا تھا -

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

مگر ضمیر پر قرآن کس طرح نازل ہو اور ضمیر جس پر قرآن نازل ہو کیسے تیار ہو ؟ اس ضمن میں حضرت علامہ ہی کا بیان پیش کیا جاتا ہے - اقتباس طویل ہے لیکن اس میں تسلی بخش جواب موجود ہے ، وہ فرماتے ہیں :

" یہ حقیقت اس طرح سمجھ میں آئے گی کہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا ، میرا معمول تھا کہ ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا ، اس دوران میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ، میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا ، کبھی کم ، ایک روز کا ذکر ہے کہ والد ماجد حسب معمول مسجد سے واپس آئے ، میں تلاوت میں مصروف تھا مگر وہ جیسے کسی خیال میں میرے پاس بیٹھ گئے ، میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا - اور منتظر تھا کہ مجھ سے کچھ ارشاد فرماتے ہیں - کہنے لگے "تم کیا

پڑھتے ہو ؟،، مجھے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا بلکہ ملال بھی ، انھیں معلوم تھا کہمیں قرآن پاک تلاوت کر رہا ہوں بہرحال میں نے مودبانہ عرض کیا ''قرآن پاک،،؟ کہنے لگے ''تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے ہو ؟،، میں نے کہا کیوں نہیں ، تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں ، کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں،، انھوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے ، میں حیران تھا کہ آخر اس سوال کا مقصد کیا تھا، کچھ دن گزر گئے، اور یہ بات جیسے آئی گئی ہوگئی ، لیکن اس واقعہ کا چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے میں حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا ۔ والد ماجد مسجد سے آئے اور میرے نے تلاوت ختم کی تو انھوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے ''بیٹا ! قرآن مجید وہی سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو،،۔۔مجھے تعجب ہوا ، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے معلوم ہوتا ہے وہ دل کی بات سمجھ گئے ، کہنے لگے ، ''تمھیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآن کسی پر نازل نہیں ہوگا ؟ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے ، ایسا کرو گے تو یہ تمھارے رگ و پے میں سرایت کر جائے گا ،، ۔ میں ہمہ تن گوش والد صاحب کی بات سنتا رہا بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت ویسے ہی کروں جیسے ان کا ارشاد ہے ۔۔ انھوں نے کہا ''سنو ! اللہ تعالی کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج پر پہنچانے کا تھا اس کا آخری ، کامل اور مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات ستودہ اوصاف میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ، لہذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام

سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کہ خاتم الانبیاء ہیں ، جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے ان میں ہر ایک کا گزر مراتب محمدیہ ہی میں سے ہو رہا تھا ۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ ذات محمدیہ کی تشکیل پر ہوا،،۔۔والد ماجد نے پھر خود ہی اپنے ارشاد کی تشریح کی انھوں نے کہا ''شعور انسانی کی تشکیل کے ساتھ ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پا لے تو ذات محمدیہ بھی اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہو گئی ، حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تشریف لے آئے ، باب نبوت بند ہوا ، انسانیت اپنی معراج و کمال کو پہنچی ، اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا اسوہ حسنہ و کاملہ بھی ہر اعتبار سے ہمارے لیے حجت ، مثال ، اور نمونہ ٹھہرا ۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا ، یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآن مجید اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو ،، [1]

ظاہر ہے کہ قرآن ضمیر پر اترے اور وحی کی طرح اترے تو جبھی قرآنی احکام اور ہدایت کو یقین کے ساتھ اور انشراح صدر کی کیفیت میں قبول کیا جائے گا اس کے بغیر قرآن کی خاطر ، اہل قرآن کی خاطر اور آئین قرآن کی خاطر اور درس و تدریس قرآن کی خاطر نہ سر دھڑ کی بازی لگائی جا سکتی ہے ، نہ راہ جہاد کھلتی ہے ، نہ شرف شہادت حاصل ہوتا ہے ، یہ سر گرمی یہ سر شاری اور عزم ، قرآن کو جزو جان بنا کر ہی حاصل ہوتا ہے ، حضرت علامہ کہتے ہیں :

مقام شوق بے صدق و یقین نیست
یقین بے صحبت روح الامین نیست

۱۔ اقبال کے حضور ، از سید نذیر نیازی ، ص ۶۰ ، ۶۱

گر از صدق و یقیں داری نصیبے
قدم بے باک نہ کس در کمیں نیست

حضرت روح الامین یعنی جبریل کا جلیس و ہمدم ہونا جس مفہوم پر دال ہے وہ واضح ہے یعنی قرآن کریم سے قلبی لگاؤ۔ اس کے بغیر ایمان و یقین کی منزل تک رسائی بے معنی کوشش ہے حضرت علامہ کی خواہش یہ تھی کہ قرآن ہر فرد مومن کا مزاج اور اس کی فطرت بن جائے۔ یعنی فرد مومن خود اپنی ذات میں چلتا پھرتا قرآن بن جائے، حضرت علامہ کا مشہور شعر ہے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن!
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

اس ضمن میں محمد حسین عرشی بیان کرتے ہیں:

"ایک دفعہ اسلام یا مسلم کی تعریف میں ایک بلیغ و عمیق تقریر فرمائی جس کو میں بمشکل سمجھ سکا، اس وقت اس کا دھندلا سا اجمال دماغ میں موجود ہے کچھ ایسا مفہوم تھا کہ انسان صحیح معنوں میں مسلم اس وقت ہوتا ہے جب قرآن کے فرمائے ہوئے اوامر و نواہی اس کی اپنی "خواہش" بن جائیں یعنی وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کسی حاکم یا آقا کے حکم و تسلط کے ماتحت فضائل اخلاق و عبادات پر کاربند اور زمائم و قبائح نفس سے مجتنب ہوں بلکہ یہ چیزیں اس کی اپنی تمنا بن کر اس کے عمق روح سے اچھلیں قرآن اس کے حق میں ایک تلخ اور شافی دوا نہ رہے بلکہ ایک لذیز اور زندگی بخش غذا بن جائے۔ منشائے الہیٰ، اور فطرت انسانی میں مغایرت نہ رہے یہی مطلب ہے فطرہ اللہ التی فطر الناس علیہا الخ کا"[1]

۱۔ ملفوظات اقبال، اقبال اکیڈیمی لاہور، ص ۸۰، ۸۱

حضرت علامہ کو قرآن کریم سے جو شغف تھا وہ کسی بھی حق آگاہ سے پوشیدہ نہیں ، اسی طرح انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شیفتگی تھی وہ بھی اہل محبت کی آنکھوں سے نہاں نہیں ---- چنانچہ قرآن و سیرت سے آگاہی کی بدولت وہ یقین کی اس منزل پر فائز تھے کہ اللہ کے حضور پکار اٹھے :

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

ظاہر ہے کہ اپنی ملت کا مستقبل جن کے سپرد ہونا ہے وہ وہی ہونے چاہئیں جن کو اپنی بصیرت اور ایمانی جذبہ بمقدار وافر میسر ہو ، حضرت علامہ کا اعتبار دیکھئے کہ خدا سے التجا کرتے ہیں کہ وہی نور بصیرت قوم کے ہر نوجوان کو بخشش دے جو تو نے مجھ کو عطا کی ہے -

علامہ خود عشق کے کس مقام پر فائز تھے یہ انہی کو معلوم ہو گا ، دعا کا لہجہ جس یقین پر دلالت کر رہا ہے وہ یقین کامل کا درجہ ہے ، یہی تھی اسلام کی روح اور قرآن کے مطالب سے کامل آگاہی کی سرشاری جس کے باعث وہ چاہتے تھے کہ اگر زندگی مہلت دے تو وہ قرآن کے مطالب قلمبند کر دیں - اس باب میں محمد احمد کہتے ہیں :

"بات یہ تھی کہ اقبال نے افکار حاضرہ اور قرآن کریم کی روشنی میں عمرانی مسائل کا مطالعہ کیا تھا اور ایک عرصہ سے ان پر غور و فکر جاری تھا بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ آخری عمر تک وہ ان مسائل پر غور و خوض کرتے رہے تھے ، لیکن پیشے کی مصروفیات اور خانگی حالات نے انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ ان خیالات کو قلمبند کرتے ، وہ یہ چاہتے تھے کہ کچھ معاشی آسودگی حاصل ہو جائے تو

بالکلیہ یکسو ہو کر اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیں - اسی لیے جب ان کے نہایت ہی عزیز دوست ڈاکٹر راس مسعود وزیر تعلیم بھوپال نے نواب صاحب بھوپال کی خدمت میں وظیفہ عطا کرنے کی تحریک پیش کی تو وہ وظیفہ قبول کرنے پر محض اس لیے تیار ہو گئے کہ انہیں اس طرح اس کتاب کے لکھنے کا موقع مل جائے گا،، ۱

مگر افسوس کہ حضرت علامہ کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی ، وظیفہ اس وقت شروع ہوا جب صحت ڈول رہی تھی ، نظر کمزور ہو رہی تھی - اور آخر وہ اس کتاب موعود کو مرتب کرنے کی حسرت اپنے ساتھ ہی لے کر راہی ملک عدم ہوئے -

---

۱- اقبال اور مسئلہ تعلیم ، اقبال اکیڈیمی ، لاہور ، ص ۳۸۹ ، ۳۹۰

جہان اقبال — جہان قرآن

حضرت علامہ اقبال کے نزدیک حکمت قرآن لازوال ہے اور قدیم ، اسے تا قیامت کار فرما رہنا ہے ، یہ حکمت کسی خاص وطن کے باشندوں کی خاطر نہیں ، کسی نسل سے تعلق رکھنے والوں کے لیے نہیں کسی خاص زبان سے وابستگان کے واسطے بھی نہیں ۔ یہ حکمت سب کے لیے ہے اس لیے کہ اصل آدم ایک ہے ۔ مادی اعتبار سے بھی ایک کہ سب مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور روحانی اعتبار سے بھی ایک کہ ایک ہی ''نفخ روح،، کے مالک ہیں بنو آدم کا ایک رشتہ آفاق سے ہے ، ایک انفس سے ۔ اور پھر لوٹ کر بھی سب کو ایک ہی مقام پر پہنچنا ہے اور وہ مقام ہے حضور ذات حق جو فالق الاصباح اور خالق الافلاک ہے ۔ وہی ذات حق مالک یوم الدین بھی ہے ۔ واضح ارشاد ہے ''والیہ المصیر،، گویا منبع بھی ایک اور مبدأ بھی ایک ، اور معاد بھی ایک ، بقول حضرت مصلح الدین شیخ سعدی :

بنی آدم اعضائے یک دیگراند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

حضرت علامہ مبدأ حیات کی وحدت کے ضمن میں فرماتے ہیں :

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام سے بہت پہلے عیسائیت نے بھی انسان کو مساوات کا سبق دیا لیکن یہ امر کہ نوع انسانی ایک جسم نامی ہے مسیحی روما کی سمجھ میں کبھی نہ آیا ، فلنٹ کہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو بات کسی عیسائی یا دولت روما کے کسی مصنف کے حق میں بالخصوص کہی جا سکتی ہے ، یہ ہے کہ اس کے ذہن میں وحدت

انسانی کا ایک مجرد تصور موجود تھا ، مگر پھر رومی عہد سے لے کر اب تک بھی تو صورت حال کچھ ایسی ہے کہ یہ تصور یورپ کے دل و دماغ میں جاگزیں نہیں ہوسکا ، برعکس اس کے وطنی قومیت کے نشو و نما سے جس کا سارا زور نام نہاد قومی خصائص پر ہے وسیع انسانیت کا جو عنصر مغربی ادب اور فن میں کام کر رہا تھا برابر دب رہا ہے لیکن اس سے کس قدر مختلف ہے عالم انسانیت کی تاریخ ، یہاں وحدت انسانی کا خیال نہ تو محض کوئی فلسفیانہ تصور تھا ، نہ شاعرانہ خواب ، بلکہ روزمرہ زندگی کا ایک زندہ اور قائم عنصر جو چپکے چپکے اور غیر محسوس طور پر اپنا کام کرتا رہا،، ۱

اور ظاہر ہے کہ اس وحدت آدم کی منشوری دستاویز قرآن حکیم ہے اور قرآن جس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس سے قرآن اتارنے والے نے بھی یہی کہا تھا ۔

''قُلْ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعاً،، ۲

کہہ دیجئے کہ میں تم سب کی طرف پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں ۔

منٹگمری واٹ لکھتے ہیں :

''موجودہ دنیا مادی اعتبار سے ایک ہو چکی ہے ، اب وہی مذہب باعث کشش ہوسکتا ہے جس کے پاس پوری دنیا کے لیے پیغام ہو ۔ اگر ہم اسلام کو اس زاویہ نظر سے دیکھیں تو یہ پوری دنیا کا مذہب قرار پانے کے ناقابل نہیں ہے،، ۳

اس سے اگلے صفحے پر منٹگمری لکھتے ہیں :

''کوئی لائحہ عمل واضح نہیں ؛ شعور بھی نمایاں نہیں ،

۱- تشکیل جدید الہیات الاسلامیہ ، ص ۲۱۵

۲- قرآن حکیم ، سورہ ۷ ، آیت ۱۵۸

۳- اسلا اینڈ دی انٹگریشن آف سوسائٹی (لندن) طبع سوم، ۱۹۶۶ء ، ص ۲۸۳

کچھ صاف دکھائی بھی نہیں دیتا اس کے باوصف محسوس یہ ہوتا ہے کہ اقوام عالم میں قرب باہم اور اتحاد و اختلاط کی جانب ایک حرکت سی موجود ہے،، -

پھر اس سے اگلے صفحے پر جو کتاب کا آخری صفحہ ہے اپنے اس عندیئے کو دھراتے ہیں کہ عالمی معاشرے کو فقط کوئی مذہب ہی متحد اور ہم آہنگ کر سکتا ہے -

بالکل عیاں ہے کہ جہاں قرآن عرب کی حدود میں محدود نہیں وہاں اسلامی معاشرے سے بھی محض عربی معاشرہ مراد نہیں - حضور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''الاسلام غریب،، اسلام پردیسی ہے ، پردیسی کا مطلب ہے کہ وہ کسی خاص علاقے سے وابستہ نہیں - اگر وطن ہی دین کی اساس ہوتی تو ابوجہل ، ابولہب ، ولید بن المغیرہ ، عتبہ بن ربیعہ ، امیہ بن خلف وغیرہ بڑے معتبر مکی تھے اور عربی بھی ، مگر اسلام مکی الوطن نہیں بقول علامہ :

مذہب او قاطع ملک و نسب
از قریش و منکر از فضل عرب

اس کا مذہب ملک اور نسب کے رشتوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ وہ خود قریش میں سے ہے تاہم عجموں کے مقابل عربوں کی فضیلت کا قائل نہیں - واضح ہے کہ اگر دین اسلام مکی الوطن ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے ہجرت نہ فرماتے اس ہجرت نے واضح کر دیا کہ یہ دین علاقائی اور ارضی نہیں اور اسلامی معاشرہ اپنے خصائص کی رو سے عام انسانی معاشروں سے مختلف ہے ،
حضرت علامہ کہتے ہیں :

عقدہ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

''ہمارے آقا نے اپنے وطن سے ہجرت فرما کر مسلم قومیت کا عقدہ حل کر دیا،،

آپ نے وطن سے ہجرت اختیار فرما کے مسلم قومیت یعنی امت اسلام کا مفہوم واضح کر دیا ، گویا ایک مستقل ترجیحی ترتیب عمل میں آ گئی کہ اگر وطن اور دین میں تصادم ہوگا تو ترجیح دین کو حاصل ہوگی اس لیے کہ ہر وطن اسلام ، اسلام کی خاطر ہے ، اور پھر ظاہر ہے کہ وطن محدود ہے اور دین لا محدود ، علامہ فرماتے ہیں :

ہجرت آئین حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است
معنی او از تنک آبی رم است
ترک شبنم بہر تسخیر یم است

''ہجرت مسلمان کی زندگی کا آئین ہے ہجرت مسلمان کی تقویت کے اسباب میں سے ہے ہجرت کا معنی کم آبی سے گریز ہے یعنی شبنم کو ترک کرنا تاکہ سمندر پر غلبہ پایا جائے - یعنی ہجرت وہ اصول ہے جس پر مسلمان کی حیات استوار ہے اور اسی اصول کے باعث امت مسلمہ کو تقویت و استحکام نصیب ہوا ، ہجرت کا معنیٰ ہے گویا تھوڑے پانیوں سے دوری اختیار کرنا یا یوں کہیے کہ شبنم کو چھوڑنا اور سمندر فتح کرنا ، گویا آپ نے ہجرت فرما کے ''الاسلام غریب،، کا عملی سبق اور درس دے دیا ، بقول علامہ :

از حدیث مصطفی داری نصیب
دین حق اندر جہاں آمد غریب

''تجھے تو رسول مقبول ؐ کے اس ارشاد گرامی سے آگاہی حاصل ہے - یعنی دین اسلام دنیا میں پردیسی کے بطور آیا ہے،، (مراد ہے یہ کسی ایک دیس سے وابستہ نہیں - یہ ''ہر دیسی ہے،،)

ہر وطن اسلام کا وطن ہے ، اس کا کوئی مخصوص وطن نہیں ۔ اسلام پردیسی ہے ، یعنی اسلام ''ہر دیسی،، ہے ، ہجرت میں اس اصول کی عملی تلقین مضمر ہے ورنہ خدائے مکہ، مکہ میں مغلوب نہ تھا ۔ ہر جگہ وہی غالب ہے مگر اسلام کو آفاقی بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دین پر وُطن کو قربان کر دیں ۔ مشرکین اور مستشرقین اپنی کوتاہ بینی کے باعث ہجرت کو فرار قرار دیتے ہیں ، اگر یہ فرار تھا تو فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس مکہ میں آکر قیام پذیر ہو جانے کی راہ میں کیا شے مانع تھی ؟ اس وقت تو تمام کفار اور مشرکین سر تسلیم خم کر چکے تھے ۔

ہاں مگر ترک وطن ایک بڑی آزمائش ہے ، دین کی خاطر عقیدے اور نظریے کی بنا پر ، سوچ سمجھ کر ترک وطن ، بڑا مشکل مرحلہ ہے ۔ جبھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا :

''أحبُّ شيئٍ عند الله الغرباءَ قيلَ من الغرباءَ قالَ الفرّارونَ بدينهم ، يجتمعونَ الىٰ عيسى ابن مَريمَ يومَ القيامَةِ،، [۱]

خدا کو پردیسی سب سے زیادہ عزیز ہیں پوچھا گیا کون سے؟ ارشاد ہوا وہ لوگ جو دین کے بچاؤ کی خاطر بھاگے پھرتے ہیں ، وہ قیامت کے روز عیسیٰ ؑ بن مریم کے درجے میں ہوں گے،، ۔

کون سے پردیسی سے واضح ہے کہ ہر طرح کے پردیسی مراد نہیں ہو سکتے تھے ، لوگ تجارت کی خاطر بھی پردیس جھانکتے ہیں ، تعلیم کے لیے بھی ، شادی کے چکر میں بھی ترک وطن کر لیتے ہیں اور منصب و ملازمت کے سبب سے بھی ، اس لیے نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے وضاحت چاہی گئی اور آپ نے

۱- عبدالقاہر بن عبداللہ ، عوارف المعارف ، بیروت ، ص ۱۲۶

وضاحت فرما دی۔

از روئے اسلام یہ تھا وطن کا مسئلہ، دوسرا مسئلہ نسل و نسب کا ہے۔ اس ضمن میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک عیاں ہے۔ جن لوگوں کو آپ نے مکہ میں چھوڑ دیا تھا وہ سب آپ کے خونی رشتہ دار تھے مگر قرآن نے برادری کا تصور ہی نیا دے دیا تھا، جو اسلام قبول کرے وہ بھائی، جو نہ کرے وہ غیر گویا نسل کو الگ کرکے رکھ دیا گیا، جو مسلمان ہونے کے باوصف نصب و نسل کے بندھن سے آزاد نہ ہو وہ حضرت علامہ کے بقول اس ذہن و فکر کا مالک ہے جسے "نا مسلم"، ذہن و فکر قرار دیا جائے گا۔ ایسا فرد کوئی ہو، کہیں ہو، کسی بھی حیثیت کا مالک ہو، اس کی فکر، اس کا چلن مسلمانہ قرار نہ پائے گا۔

مذہب اوقاطع ملک و نسب
از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بریک خواں نشت
قدر احرار عرب نشناختہ
با کلفتان حبش در ساختہ
احمران با اسوداں آمیختند
آبروئے دود مانے ریختند

یہ الفاظ جاوید نامہ میں "نوحہ ابوجہل" کے زیر عنوان درج کئے ہیں۔ صاف بات ہے فلاں ابن فلاں ابن فلاں ابن کہہ کر کسی کی رگ رعونت پھولتی ہے تو یہ عمل وحدت آدم کے بنیادی عقیدے کے خلاف اور خَلَقَکُم مِّن نَّفسٍ وَّاحِدَۃٍ" (ہم نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا) کے مبدا سے مزاحم ہے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی رح نے اپنا نصب نامہ یہی بتایا تھا کہ مسلمان ابن اسلام، ابن اسلام، تا آدم۔ جب اسلام ہی باوا بن گیا تو باقی آبا ایک

طرف ہوگئے - قرآن کے پیش نظر جغرافیہ ، نسل اور زبان نہیں قرآن کے پیش نظر انسان ہے اور اسلام جس کو اخوت کہتا ہے وہی اپنے ہمہ نوعی معنوں میں قرآنی تعلیم کا مغز ہے، یہ اخوت درحقیقت انسانیت کے شفقت آموز ، محبت آمیز رویے کا نام ہے -

قرآن کا قاطع نسب و نسل ہونا اصطلاحاً تو ہجرت کے عمل سے ثابت ہو جاتا ہے - مگر غزوہ بدر نے اس ضمن میں لغوی مفہوم بھی بتا دیا - غزوہ بدر کا فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کے علمبردار ایک اصولی برادری ہیں ، ان کا رشتہ روحانی ہے - چنانچہ غزوہ بدر کے موقع پر امت ایک طرف تھی - اور قوم دوسری طرف ، قوم میں اہل مکہ تھے جو خونی رشتہ دار تھے ، امت میں اکثریت ان کی تھی جو قریش نہ تھے - کچھ وہ بھی تھے جو عرب ہی نہ تھے جن جن سے روحانی اور ایمانی رشتہ استوار ہوگیا وہ یگانے ٹھہرے ، اور جو اس روحانی اخوت کے قائل نہ ہوئے وہ بیگانے قرار پائے - یہ بحث میں اپنی کتاب ''ایقان اقبال،، کے مقالے ''اقبال کا تصور ملت ماضی ، حال ، استقبال،، میں بھی کر چکا ہوں -

ان دو مخالف صفوں کی کیفیت نرالی تھی - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تھے اور آپ کے حقیقی چچا عباس بن عبدالمطلب اور آپ کے داماد یعنی حضرت زینب (حضرت خدیجہ الکبری کی صاحبزادی) کے خاوند ابوالعاص اور چچا زاد بھائی عقیل بن ابی طالب او بعض روایات کی رو سے عقیل کے بڑے بھائی طالب بھی دوسری طرف ، حضرت عمر ایک طرف تھے اور ماموں دوسری طرف - (ان کا اپنا قبیلہ عدی قریش کی حمایت میں شریک غزوہ بدر نہ ہوا) حضرت علی ایک طرف تھے اور محسن چچا عباس اور بھائی عقیل دوسری طرف ، حضرت ابو عبیدہ رض ایک طرف تھے اور ان کے والد جراح دوسری طرف ، حضرت حکم رض بن سعید بن العاص ایک طرف تھے اور ان کا بھائی عبیدہ بن سعید بن العاص

دوسری طرف ، حضرت ابو حذیفہؓ ایک طرف تھے اور ان کا والد عتبہ بن ربیعہ دوسری طرف ، حضرت صدیق اکبر ایک طرف تھے اور ان کے فرزند عبدالرحمان دوسری طرف ، یہ سارے باہم قریب ترین رشتہ دار تھے - باپ ، بیٹا ، بھائی ، بھتیجا ، چچا ، ماموں ، بھانجا ، خسر ، داماد وغیرہ مگر روح نے خون کو کاٹ کر پرے پھینک دیا ، امت (ملت) نے قوم کو ہمیشہ کے لیے ٹھکرا دیا ، اور ہمیشہ کے لیے ایک روشن اصول قائم کر دیا کہ اہل دین کے نزدیک اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل کی راہ میں حائل ہر شے شعبۂ عداوت سے تعلق رکھتی ہے خواہ وہ بظاہر کتنی ہی عزیز ہو -

باقی رہا زبان و لسان کا عنصر جسے آج کل سیاسی اصطلاح میں کسی قوم یا قومیت کے بنیادی عناصر میں شمار کیا جاتا ہے تو عیاں ہے کہ اہل مکہ کی وحی اُس زبان تھی جس زبان میں قرآن کریم نازل ہوا تھا - اور پورے عرب میں قریش کی زبان کو مرکزی اور فصیح ترین زبان کا درجہ حاصل تھا - ابولہب اور امیہ اور اسی طرح دیگر کفار و مشرکین مکہ لغوی معنوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زبان تھے فقط فرق یہ تھا کہ ہم مقاصد نہ تھے -

مختصر یہ کہ مادہ پرستوں کا نیشنلزم جن سہاروں پر استوار ہے اور جس نیشنلزم کے باعث نوع انسان، نوع انسان کی شکاری ہے قرآن اس فساد کو برباد اور اس شرارت کو غارت کرنے آیا تھا- قرآن نے رشتوں کی ساری نسبت ہی بدل دی ، اور غرور و نخوت کے پیمانے ہی نئے وضع کر دیے - انسان قرب اور برتری کے معیار نسب نسل ، ، زبان ، رنگ ، مال منال کی رو سے قائم نہیں کئے جائیں گے بلکہ جو جتنا صاحب تقویٰ ہو گا اور بدی سے بچے گا ، وہ خدا کے نزدیک اتنا ہی مکرم ہوگا - جو بدی سے جتنا قریب

ہوگا اور اتقا سے جتنا عاری ہوگا وہ خدا سے اتنا ہی دور ہوگا۔ اور بے قدر بھی۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ [1] (سورہ ۴۹، آیت ۱۳)

بیشک جو تم میں سب سے زیادہ صاحب تقویٰ ہوگا وہی خدا کے نزدیک سب سے بڑھ کر معزز ہوگا"۔

اس طرح قرآن نے اولاد آدم کی بلندی و پستی کے معیار بدل دیے مادی معیارات کی جگہ روحانی اور اخلاقی معیارات نے لے لی۔ ہر قدر کو اخلاق آدمیت کے تابع کر دیا گیا۔ اور کسوٹی عمل کو قرار دے دیا گیا، اور ایک ایسا عملی سانچہ تیار کر دیا جس کے اتباع سے آدمی بہتر سے بہتر آدمی بنتا چلا جائے۔ حضرت علامہ سے استفسار کیا گیا کہ آپ کا نظریہ فوق البشر کیا ہے آپ نے فرمایا:

"ہر صحیح مومن فوق البشر ہے اور اسلام وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں" [2]

حضرت عمر بن الخطابؓ کا ارشاد ہے:-

"وَاللہِ لَئِنْ جَاءَتِ الْاَعَاجِمُ بِالْاَعْمَالِ وَجِئْنَا بِغَیْرِ عَمَلٍ فَھُمْ اُولٰی بِمُحَمَّدٍ مِنَّا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَاِنَّ مَنْ قَصَّرَ بِہٖ عَمَلُہٗ لَا یُسْرِعُ بِہٖ حَسَبُہٗ" [3]

"بخدا اگر قیامت کے روز اہل عجم با عمل آئے اور ہم بے عمل پہنچے تو وہ ہمارے مقابل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوں گے۔ جو عمل کی رو سے سست ہوگا اسے حسب و نسب کے باعث تیزی رفتار حاصل نہ ہوگی"

---

۱ - قرآن حکیم، سورہ ۴۹ آیت ۱۳

۲ - ملفوظات اقبال، مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ص ۲۱۲ -

۳ - حقائق السلام - از عباس محمود العقاد، دارالکتاب العربیہ، بیروت، ص ۲۷۷ -

اصل فساد آدمیت ، آدم کی آدم ناشناسی ہے - اور آدم ناشناسی کا نقطہ آغاز آدم کی ناخود شناسی ہے - کوئی انسان مقام آدمیت سے نا آگاہ رہ کر یا غافل ہو کر درجہ بہیمیت و وحشت سے بلند نہیں ہو سکتا - پھر جو جتنا قوی اور صاحب وسائل وحشی ہو وہ اتنا ہی زیادہ بے درد اور خونخوار ثابت ہوتا ہے - یہ بہیمیت اور وحشت از روئے خصلت چھوٹوں میں بھی پائی جا سکتی ہے اور بڑوں میں بھی ، کمزوروں میں بھی زور داروں میں بھی - ہاں ضرر رسانی کی حدود کا دائرہ نسبت تناسب کی رو سے تنگ یا وسیع ہو سکتا ہے ، ضرر رسانی اور غارت گری محض طبقاتی کشمکش کا نتیجہ نہیں ہوتی درحقیقت وہ حیوانی ہوس ہے جو درجات پیدا کرتی ہے - کون کم صید ہوس ہے اور بہتر آدمی ہے اور کم زیادہ صید ہوس ہے اور بدتر آدمی ہے - خواہ بظاہر دینوی منصب اور مرتبہ کچھ بھی ہو - ایک بظاہر بڑا عالی شان انسان روح انسانیت کے اعتبار سے ممکن ہے فقط ایک غلیظ کیڑا ہو اور ایک بظاہر بے منصب و جاہ شخص اخلاق آدمیت کی نسبت سے ایک باوقار فرد بشر ہو - اصل مسئلہ کمزوری یا شہ زوری نہیں - اصل مسئلہ تمیز خیرو شر اور خیر کی پاسداری اور شرر سے اجتناب ہے کمزوروں کا شر اگر محدود ہے تو اس لیے کہ ان کے شر کو پاؤں پھیلانے کے لیے چادر ہی چھوٹی ملی ہے اس میں نیک نیتی کا کوئی دخل نہیں -

انسانی اخلاق کے اعتبار سے نا تربیت یافتہ شخص غریب ہو یا امیر اپنے اختیارات کو غلط طریق پر ضرور استعمال کرے گا لہذا اصل بات یہ ہے کہ آدمی کے مزاج سے حیوانیت نکال دی جائے اور یہ اس کی روحانی قوت کو بیدار اور با اقتدار کئے بغیر ممکن نہیں - ہوس کی مادی بیماریوں کا کامل علاج مادی امدادات سے نہیں کیا جا سکے گا - اصل میں ظلم و استحصال کا ذوق ختم

کرنے کی ضرورت ہے ۔ پھر نہ طبقے بنیں گے ، نہ ان کے مابین جنگ و جدال کا بازار گرم ہوگا ۔ قانون اور آئین کتنا ہی سخت ہو اگر تربیت وہ نہ ہو جسے تربیت آدم کہتے ہیں یا الفاظ دیگر جسے تربیت اخلاق قرار دیا جاتا ہے تو صحیح نتائج برآمد نہ ہوں گے ، قانون کا شکنجہ افراد معاشرہ کو شریف ظاہر کرے تو کرتا رہے ، اندر سے وحشی خصلت جلوہ گری کے لیے مواقع تلاش کرتی اور مواقع بہم پہنچانے کے بارے میں رہبری کرتی رہے گی ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ پوری دنیا کے ذرائع نشر و اطلاع نے یہ بھیانک خبر ہر گوشہ عالم میں پہنچا دی کہ نیو یارک میں ایک شب بجلی بند ہو جانے کا نتیجہ کیا نکلا ، دنیا کے اس بہت بڑے تمدنی مرکز میں آناً فاناً ہزاروں انسان خونخوار وحشی بن گئے ، بہیمیت لوٹ آئی اور ظلم و زیادتی کا وہ بازار گرم ہوا کہ توبہ بھلی ۔ سینکڑوں دکانیں غارت ہوئیں درجنوں بے گناہ عورتیں زبردستی اٹھا لی گئیں عصمت بالجبر لوٹی گئیں ، قتل بھی عمل میں آئے ۔ پولیس والے بھی مجروح و مقتول ہوئے ۔ (کم از کم پولیس کی فرض شناسی لائق داد ہے کہ وہ اندھیرے اور خوف کے مارے اپنے دفتروں میں دبکے نہیں رہے تھے اور جو کچھ ان کے بس میں تھا کرنے کے لیے کوشاں رہے) ۔ گویا بجلی کیا فیل ہوئی مہذب انسان کے اندر کی تاریکی باہر نکل کر کھل کھیلنے لگی ۔ حقیقت یہ ہے کہ شرف انسانیت سے محروم سارے معاشروں کا امن و امان ایسا ہی ہے جیسے وحشیوں کو پنجروں میں بند کر دیا گیا ہو ۔ قانون کی سختی یا لوہے کے پنجرے میں کوئی فرق نہیں ۔ ذرا پنجروں کے در کھولیے یا قانون کی گرفت ڈھیلی کیجئے پھر تماشا دیکھ لیجئے ۔ یہ ضروری نہیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں ہی یہ کچھ ممکن ہے اور کمیونسٹ معاشرے میں ممکن نہیں شرط تو فقط شکنجہ ڈھیلا

ہونے کی ہے اس لیے کہ دونوں کے معاشروں کی اساس مادی ہے مقابلہ مادی ہے ، تصادم مادی ہے - اور ہوس کے آگے دونوں معاشرے بے بس ہیں - لیوی کہتا ہے :

''اس کے مقابل اسلام کے آئین کا ربط اصلاً اور اساساً اخلاق سے ہے - تمام ضابطے اخلاق پر استوار ہیں لہذا دیوانی جھگڑے ہوں یا فوجداری ، وہ محض قانون شکنی نہیں اور نہ محض احترام قانون - ان کے ساتھ نیکی اور بدی ، ثواب و گناہ اور جنت و دوزخ کا تصور بھی وابستہ ہے،، [۱]

اور حق یہ ہے کہ خدائے واحد کے تصور کے بغیر جو قادر مطلق ہے جو جزا و سزا کے باب میں آخری حاکم بھی ہے اور حکم بھی ہے ، کوئی متفقہ لائحہ اخلاق عمل میں آ ہی نہیں سکتا ، یہ کام فلاسفہ کا نہیں - فلاسفہ غور فرما سکتے ہیں - مگر خیر و شر کے مطلق مفاہیم کے ضمن میں متفق نہیں ہو سکتے اور اگر ہوں بھی تو اخلاق کا تعلق عمل سے ہے ، فلسفہ سوز دماغ ہے ساز یقین نہیں - اسلام میں ایک خدا کا حکم چلتا ہے اور خدا کے حضور میں سب عاجز ہیں اسلامی معاشرے میں (اگر وہ واقعی اسلامی معاشرہ ہو) کوئی شخص نہ قانون سے بالا ہے اور نہ ساقط الحقوق - حضرت علامہ نے اسلامی آئین کی مساوات گستری کی مثال کے طور پر سلطان سلیم اور معمار کا قصہ رقم کیا ہے کہ بادشاہ نے بے جرم معمار کا ہاتھ کٹوا دیا ، قاضی نے سلطان سلیم جیسے جابر اور مطلق العنان شخص کو عدالت میں بلوا لیا اور فیصلہ صادر کر دیا کہ قصاص میں سلطان کا ہاتھ کاٹ دیا جائے ،

حضرت علامہ کے الفاظ یہ ہیں :

عبد مسلم کم تراز احرار نیست
خون شہ رنگین تر از معمار نیست

۱- ریوین لیوی ، سوشل سٹرکچر آف اسلام (کیمبرج ۱۹۶۵ء) ص ۱۹۲ -

"غلام مسلمان ، آزاد مسلمانوں سے کم تر ہرگز نہیں ، بادشاہ
کا خون معمار کے خون سے زیادہ رنگین نہیں،،

جامع دمشق کی دیوار کج ہے اور تیرہ سو سال سے کج ہی چلی آ رہی ہے ، ہوا یوں کے کہ ملحقہ زمین کے مالک نے اپنی زمین دینے سے انکار کر دیا ، خلیفہ وقت نے حاکم دمشق کو لکھا کہ دیوار کا کج رہنا بہتر ہے اس سے کہ کسی کا حق سلب کیا جائے ۔ حائطٌ معوجٌ خیرٌ مّنْ حقٍ یستلَبٌ [۱]

حضرت علامہ نے علامہ جمال الدین افغانی کی زبانی ملت روسیہ کو یہی پیغام دیا ہے کہ قرآن کی روشنی میں خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ شریعت کے مطابق ظہور میں آنے والی اخوت ہی اصل شے ہے جس میں قیصری و کسرائی نا پید ہوکر رہ جاتی ہے مگر اس کے لیے روح کے اندر انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور وہ انقلاب ایک خدا پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں اس لیے کہ یاد خدا کی برکت اور روشنی کے بغیر افکار صحیح سمت کی جستجو میں کامیاب نہیں ہو سکتے ۔ بہرحال حضرت علامہ نے مولانا جمال الدین افغانی کی زبانی روس کو مخاطب کرکے کہا ۔

داستان کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از ام الکتاب
باسیہ فاماں ید بیضا کہ داد
مژدہ لا قیصر و کسریٰ کہ داد ؟
جز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقر قرآں اصل شاہنشاہی است
فقر قرآں اختلاط ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بذکر

۱- مصطفیٰ غالب ' بسم اللہ الشیوعیتہ و کفیٰ ' ۱۹۶۳ ، ص ۵۸ ، ۵۹

"تو نے کہنہ قصوں کا ہر باب دھو ڈالا ۔ اب سورۂ فاتحہ کی تلاوت کر تاکہ تیری آنکھ روشن ہو جائے،،

"سیاہ فام اقوام کو یدبیضا کا مالک کس نے بنا دیا ؟ یہ خوش خبری کس نے دی کہ نہ قیصر رہے گا اور نہ کسریٰ،،

"اگر قرآن (کی تعلیم) پیش نظر نہ ہو تو شیری بھی لومڑی پنا ہے ، قرآن کی عطا کردہ درویشی حقیقی بادشاہی ہے ،،

"قرآن کا فقر تو ذکر اور فکر کے ملاپ اور اختلاط کا نام ہے ، بغیر ذکر کے میں نے فکر کو با کمال ہوتے دیکھا نہیں،،

اگر عالم انسانیت کا مصدر ایک ہے معاد ایک ہے ، تو معاش ایک کیوں نہ ہو ؟ ان کی زندگی کے مسائل و سائل کو بھی تو کسی ایک ضابطے کا پابند کرنا ہوگا اور یقیناً وہی ضابطہ مفید اور کامیاب ترین قرار دیا جا سکتا ہے جو قرآن کی بنیادی اور اصولی ہدایت کے تحت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرمایا تھا۔ اور جس میں آپ کے خلفا نے پھیلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق وسعت دے کر آنے والی نسلوں کے لئے بڑے نمایاں خطوط متعین کئے اور خاکے بنائے تھے ، لہذا عالم انسانیت کے لئے یہ بات قطعاً مفید نہ ہو گی کہ اسے اخلاقی اور روحانی تعلیم تو قرآن کریم کی روشنی میں دی جائے اور اس کی معاش غیر قرآنی اصولوں پر استوار کی جائے - یہ تو قرآن پر جزواً ایمان لانے والی بات ہوئی

"أفتؤ منونَ ببعض الکتاب وَ تکفرونَ ببعضٍ (سورہ ۲ آیت ۸۵)

"کیا تم قرآن کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کو رد کرتے ہو،،

عالم انسانیت جب عالم قرآن بنے گا تو جب کہیں انسان کے عذاب ختم ہوں گے وہ عالم قرآن کیا ہو گا ؟ حضرت علامہ نے مولانا جمال الدین کی زبانی زندہ رود (خود علامہ اقبال) کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے -

سوال زندہ رود :

زورق ما خاکیان بے ناخدا است
کس نداند عالم قرآں کجا است !

”ہم اہل خاک کی کشتی ملاح سے محروم ہے ، کسی کو معلوم نہیں کہ عالم قرآن کہاں ہے ؟،،

جواب افغانی :

عالمے در سینہ ما گم ہنوز
عالمے در انتظار قم ہنوز
عالمے بے امتیاز خون و رنگ
شام او روشن تر از صبح فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید
چوں دل مومن کرانش نا پدید
عالمے رعنا کہ فیض یک نظر
تخم او افگند در جان عمرض
لا یزال و وارداتش نو بنو
برگ و بار محکماتش نو بنو
باطن او از تغیر بےغمے
ظاہر او انقلابے ہر دمے
دل بآیات مبیں دیگر ببند
تابگیری عصر نو را در کمند

”وہ ایسی دنیا ہے جو تا حال ہمارے سینوں میں پوشیدہ ہے ، وہ ایک ایسی دنیا ہے جو تا حال حکم قم کی منتظر ہے،،
”وہ ایسی دنیا ہے جس میں رنگ و بو امتیازات نہ ہوں گے ، اور جس کی شام بھی صبح فرنگ سے روشن تر ہو گی،،
”ایسی دنیا جس میں نہ بادشاہ ہوں گے نہ غلام ، اور جو دل مومن کی طرح فراخ ہوگی ،، (اس میں تعصبات کی تنگیاں نہ ہوں گی)

''ایسی جمیل دنیا جس کا بیج عمررض کے دل ایک نظر کے فیض نے بو دیا تھا،،

''وہ لازوال اور ابدی دنیا جس کے واردات ہر دم تازہ ہوں گے اور جس کے واضح امور و احکام کا حاصل ہر دم نیا ہو گا،،

'' (جہان قرآن وہ ہوگا) جس کا باطن تغیر سے بے فکر رہے گا اور جس کا ظاہر ہر لحظہ ایک نئے انقلاب سے سر شار رہے گا،،

تو دوبارہ قرآن کی آیات کے ساتھ دل کو وابستہ کر لے تاکہ تو عصر نو کو اپنی کمند میں گرفتار کر سکے ،

مختصر یہ کہ وہ جہاں یعنی جہاں قرآن ابھی انتظار ''قم،،میں ہے وہ جلوہ نمائی کے لئے بے تاب ہے اس جہاں میں رنگ و خون اور آقا و غلام اور شاہ و گدا کی تمیز نہ ہوگی - وہ عالم حسین جس کی ایک جھلک نے حضرت عمررض کو متغیر کر دیا تھا ، وہ دائمی عالم جس میں نئے نئے جلوے اور نئے نئے تماشے جنم لیتے رہتے ہیں، لہذا اس کی آیات محکمات کی شان خوب سے خوب تر ہو کر سامنے آتی رہے گی ، اس کے مبادی و اصول بڑے محکم ہیں - بظاہر خارجی تقاضے بدلتے رہیں گے اور وہ اصول ان خارجی تقاضوں سے بخوبی نمٹتے رہیں گے ، عصر نو کی زمام جبھی تھام سکو گے کہ قرآن پر از سر نو بتمام و کمال عمل پیرا ہو جاؤ -

حضرت علامہ نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں بھی

خوش تر آں باشد کہ سردلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

کا اسلوب اختیار کیا ، جاوید نامہ میں جہان قرآن کا تصور حضرت جمال الدین افغانی کی زبان سے واضح کرایا واں مجلس شوریٰ میں ابلیس کی زبانی اپنا یہ عندیہ واضح کیا کہ اسلام ہی دنیائے آدم

کا وہ دین ہے جس نے صحیح معنوں میں انسانی معاشرے کے اندر اخوت کی روح پھونکی اور ایک اصولی برادری کو جنم دیا - یہ وہ دین ہے جو اصولوں پر مبنی ہے ، بس کسر اتنی ہے کہ جن لوگوں کو اس دین کا حامل جانا جاتا ہے وہ خود غافل ہیں - وہ احساس کمتری میں مبتلا ہیں اس لئے کہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سلطانی لولاک کے لیے ابدی دستور عطا کر رکھا ہے - وہ دستور قرآن ہے جو بے مثل مثالی سوسائٹی کی تعمیر کا واضح نقشہ پیش کرتا ہے - وہ سوسائٹی جس میں احترام آدمیت کی روشن تربن علامت ہو ، لہذا کوئی کسی کا حق نہ چھینے ، کوئی کسی کو اپنے سے کمتر نہ جانے ، کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے ، وہ سوسائٹی جس کے افراد ایمان محکم کی بدولت فقط اللہ سے ڈریں ، موت کو خاطر میں نہ لائیں ، حضرت علامہ نے ابلیس کی زبانی یہ بھی واضح کر دیا کہ اشتراکی نظریات کی اساس محض ایک رد عمل ہے - ایک ذہنی ژولیدگی ہے ، ایک ہلچل ہے اور بس ، یہ نظریات انسان کے دائمی ہمہ نوعی تقاضوں کا جواب نہیں :

دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشان روز گار ، آشفتہ مغز ، آشفتہ ہو
ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں - اسلام ہے

ابلیس کی زبانی اشتراکیت پر یہ اجمالی تبصرہ کرا چکنے کے بعد

اس کے منہ سے وہ اصول بیان کرائے جن کا نفاذ انسانوں کو ہر ابلیسی دام سے نجات دلا سکتا ہے بشرطیکہ وہ حامل قرآن اور صحیح معنوں میں حامل قرآن ہوں :

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن ، مرد آزما ، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و سلطاں نے گدائے رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقین
ہے یہی بہتر الہیات میں الجھا ہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

آخری شعر میں یہ عجیب و غریب طنز پوشیدہ ہے کہ جس قرآن کی بدولت مسلمان کو دنیائے اقتدار کی زمام اپنے ہاتھ میں لینا تھی یہ اسی قرآن کو غلط سلط نئے معانی پہنانے اور اس کے باطنی مفاہیم تلاش کرنے کے شوق میں الجھ کر رہ گیا ہے ۔ اور اس طرح جہاد زندگی سے فارغ ہو گیا ہے ۔ قرآن کے نام پر فارغ ہو گیا

ہے - وہ قرآن جو جہاد زندگی کا درس دینے والی کتاب ہے -

محولۂ بالا اشعار کی روشنی میں علامہ کا وہ بیان اور بھی بین اور صریح نظر آنے لگتا ہے جو انہوں نے ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ زمیندار میں شائع کرایا تھا - جس میں انہوں نے اس الزام کی تردید بالتاکید کی تھی کہ وہ بالشویک خیالات کے مالک ہیں - اس بیان کی آخری سطور یہ ہے :

''مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ، ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے - ''فَاَصبحتم بنعمتہ اخواناً'' میں اسی نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں بن سکتے جب تک وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اند رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو - اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے - موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو اس کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی ، ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہوجاتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کی اقتصادی تعلیم پر نظر

ڈالیں ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل اس کتاب میں پالیں گے،، [۱]

حضرت علامہ بالشویک خیالات کے مالک کیا ہوئے انہیں تو دکھ اس بات کا ہے کہ مسلمان خود یورپ کی پولیٹکل اکانومی کے سطحی مطالعہ کے زور پر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ۔ اور وہ منتظر تھے کہ دیکھئے خود روس کب اپنے طریق عمل میں ترمیم کرکے اسلام کے دامن راحت میں پناہ لیتا ہے ۔

یونانی فلسفہ یورپ کے مزاج میں اس طرح داخل ہوا اور یونانی علم الاصنام نے وہ اخلاقی پیمانے اور سانچے یورپ کو دیئے کہ مسیحیت بھی اس کا تدارک نہ کر سکی بلکہ مسیحیت خود بھی یونانیت کی نذر ہو گئی ۔ یونانیت کا پیرتسمہ پا یورپ کی ہمہ جہتی زندگی کے شانوں پر اس طرح پختگی کے ساتھ سوار ہے کہ اترنے کا نام نہیں لیتا۔

مادہ پرست یونانیت کا پیرتسمہ پا خود مسلمان مفکرین ، عقلیین اور فلاسفہ کے لئے بھی بہت سے معاملات میں الجھن پیدا کرنے کا باعث بن گیا ، لہذا قرآن کی صریح تعلیمات یونانی استدلال اور رویہ و طرز عمل کی پیدا کردہ دھند میں دھند لانے لگیں ۔ اس ضمن میں خود حضرت علامہ کی اپنی تشریح لائق ملاحظہ ہے وہ کہتے ہیں :-

”فلسفہ یونان کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک زبردست ثقافتی قوت کی رہی ہے ، لیکن جب ہم علم کلام کے ان مختلف مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں جن کا ظہور فلسفہ یونان کے زیر اثر ہوا اور ان کا مقابلہ قرآن پاک سے کرتے ہیں تو یہ اہم حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ یونانی فلسفے نے مفکرین اسلام

---

۱ - گفتار اقبال ، جنوری ۱۹۶۹ء ص ۷ ، ۸

کے مطمح نظر میں اگرچہ کچھ وسعت پیدا کی مگر بحیثیت مجموعی قرآن مجید میں ان کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی، سقراط کی توجہ صرف عالم انسان پر تھی۔ اس کے نزدیک انسان کے مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہو سکتا تھا نہ کہ نباتات اور حشرات یا ستاروں کی دنیا۔ مگر اس سے کس قدر مختلف ہیں قرآن پاک کی تعلیمات جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی ایسی حقیر شے بھی وحی الٰہی سے بہرہ‌ور ہوئی اور جس نے بار بار اس امر کی دعوت دی کہ ہواؤں کے مسلسل تغیر و تبدل کا مشاہدہ کیا جائے۔ نیز دن رات کے اختلافات، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا جو فضائے لا محدود میں تیرتے پھرتے ہیں۔ سقراط کے شاگرد رشید افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے شدید نفرت رہی، اس کا خیال تھا کہ ادراک بالحواس سے کوئی علم تو حاصل نہیں ہوتا، تاہم اس کی بنا پر صرف ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے بر عکس اس کے قرآن مجید نے سمع و بصر کا شمار اللہ کے گراں قدر انعامات میں کیا اور عنداللہ اپنے اعمال و افعال کا جواب دہ ٹھہرایا۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے شروع شروع کے مسلمانوں نے قرآن مجید کے مطالعے میں یونانی ظن و تخمین سے مسحور ہو کر نظر انداز کر دیا، بہ الفاظ دیگر انہوں نے اس کا مطالعہ بھی فکر یونان کی روشنی میں کیا اور پھر کہیں دو سو برس میں جا کے سمجھے اور وہ بھی پورے طور پر نہیں کہ قرآن پاک کی روح اساساً یونانیت کے منافی ہے"[۱]

یونانیت کا ایک یہی نقص کیا کم ہے کہ خدائے واحد کا واضح تصور نہیں ابھرتا، یونانیوں کا خدا بے بس سا خدا

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۵، ۴

ہے۔ وہ محرک غیر متحرک ہے۔ وہ ایک بار کائنات کی مشین کو چالو کر کے بیٹھ رہا ہے، وہ حاکم ہے، بے حدود قلمرو کا مالک ہے مگر بے اقتدار ہے۔ ایسا خدا مجیب الدعوات نہیں ہو سکتا جبکہ قرآن کا خدا دعا قبول کرتا ہے۔ پھر یہ کہ یونان کا خدا

اُجِیبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (سورہ ۲ آیت ۱۸۶)

فاطر السموات والارض نہیں یعنی وہ خلاق نہیں جس نے عدم سے وجود پیدا کیا، یونانیت کا تصور خدا اخلاق کی صفت سے تقریباً خالی ہے۔ اس لیے کہ یونانیت بالعموم مادے کو بھی ازلی مانتی ہے۔ گویا خدا نے مادے سے اسی طرح کام لیا جس طرح بڑھئی لکڑی سے کام لیتا ہے، بڑھئی لکڑی کو مختلف صورتیں عطا کر سکتا ہے، مگر وہ لکڑی کا خالق نہیں۔ خلاق اور صناع میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قرآن کے خدا نے نہ صرف یہ کہ ہر شے پیدا کی اور کئے جا رہا ہے بلکہ ہر شے کا ایک ضابطہ، اندازہ قاعدہ اور تخمینہ بھی مقرر کر دیا ہے جس کے مطابق ہر شے کو اپنی تکمیل کرنا ہے۔ اور اپنی تقدیر حاصل کرتا ہے۔

اَلا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمر (سورہ ۷، آیت ۵۴)

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرضِ (سورہ ۵۷، آیت ۱)

ہر شے کو اپنی تکمیل کے لیے سرگرم رہنا یا اپنی تقدیر کو حاصل کرنے کے درپے رہنا ظاہر کرتا ہے کہ شے کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا لٰعِبِیْنَ

(سورہ ۲۱، آیت ۱۶)

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ دیوتاؤں نے اپنے دل بہلاوے اور تفریح کی خاطر یہ کھیل پیدا کر دیا جس کو دنیا کہتے ہیں۔

اس طرح گویا ''آدمی،، محض ایک کردار ہے۔ اسے ایک رول دے دیا گیا ہے اور اس میں اس کی اپنی کوئی مرضی اور اپنے انتخاب و اختیار کو کوئی دخل نہیں ۔ لہذا اگر اس کی جواب دہی ہوگی تو اس عالم میں کہ اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا ، قرآن کا انسان عقل و دانش کے درجے کے مطابق جواب دہ ہے ، اور ہر ایک کو اپنا اپنا حساب جدا جدا دینا ہے :

وَ کُلُّھُم اتیہ یَومَ القیامۃ فرداً (سورہ ۱۹ ، آیت ۹۵)

خواہ کسی فرد کا عمل اس کی انفرادی حیثیت سے زیادہ تعلق رکھتا ہو یا اس کی اجتماعی حیثیت سے مگر جزا و سزا کے لیے اس کو اکیلے ہی حاضر ہونا ہوگا ۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں ترا امتحان ہے زندگی
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا
اے طائر لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

محمود العقاد لکھتے ہیں :

''اسلام انسان کے گلے میں کوئی موروثی گناہ کا طوق نہیں ڈالتا کسی کو اپنے والد کی جگہ حساب نہیں دینا پڑتا ۔ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا ۔ مسلم کا ایمان ہے

کہ اسے کسی کمتر مخلوق میں تبدیل نہیں کیا جائے گا انسان کا بلندی کی طرف سفر یا پستی کی جانب انتقال اس کی اپنی ذمہ داری ہے یہ اس کی اپنی تکلیف امانت ہے وہ تکلیف (ذمہ داری) کے بلند ترین مقامات پر بھی پہنچنے کی اہلیت کا مالک ہے اور اسفل السافلین تک بھی گر جانے کی قابلیت رکھتا ہے یہ "تکلیف امانت" اسے ایک طرف فرشتوں سے اونچا لے جاتی ہے اور دوسری طرف شیطانی کے زمرے میں نیچے پھینک دیتی ہے "[1]

غرض کہاں خدائے یونان، اور کہاں خدائے قرآن — خدائے قرآن آدم کو درجہ عقل و بنیش کے مطابق اور اہلیت و اختیار کے موافق ذمہ دار فرد اور مختار وجود قرار دیتا ہے جسے اپنی ہمت سے اپنی تکمیل کرنا ہے اور جہاں قرآن ہی در حقیقت وہ جہاں ہے جس میں انسان اپنی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں بروئے کار لا سکتا ہے، لیوی لکھتا ہے:

"انسان کی زندگی کا مقصد و منتہا تکمیل حاصل کرنا ہے یہ مقصد ایسا ہے کہ انسان کے اپنے دائرہ اختیار میں ہے اور اگر وہ اپنے خیالات و تصورات کو اپنی قدرت اور صلاحیت کے مطابق عمل میں ڈھال لیتا ہے تو درجہ کمال حاصل کر لیتا ہے"[2]

اور تکمیل آدم کی صورت ہے "تخلقو باخلاق اللہ"

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ" (سورہ ۲، آیت ۱۳۸)

اللہ کے اخلاق اپنانا اور اللہ کے رنگ میں رنگے جانا۔ اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے۔ اور اللہ کے اوصاف

---

۱ - حقائق الاسلام، ص ۱۰۹، ۱۱۰

۲ - سوشل سٹرکچر آف اسلام، ص ۲۲۹

اس کے اسمائے حسنہ ہیں جو شاہد ہیں اس کی غفاری ، قہاری ، رحم ، لطف ، رحمت ، قدرت ، کرم ، احسان ، عفو ، عدل ، حکومت ، رشد حلم ، سلام ، جمال ، جلال اور علی ہذا القیاس ان صفات پر جن کو اپنا کر انسان اپنے اندر وہ توازن اور قوت پیدا کر سکتا ہے ، جو اسے صحیح معنوں میں مرد مومن اور مرد کامل بنا دے ۔ یہ یونان کے مادہ پرست نظریات بپھر کر کسی فوق البشر کا تصور تو پیش کر سکتے ہیں مگر خیر البشر کا تصور ان کے بس کی بات نہیں ۔

حضرت علامہ دانش فرنگ کے خلاف اگر فریاد کرتے ہیں تو اسی لیے کرتے ہیں کہ فرنگ کے یونان گزیدہ افکار جدیدہ ، آدم کو مقام آدم سے آگاہ نہیں ہونے دیتے اور آدم مقام آدم سے کیونکر آگاہ ہو ۔ جب تک خدائے واحد کی شان احدیت ، واضح طور پر مقصود نہ ہو ، ممکن نہیں ۔ حضرت علامہ مادی قوت رکھنے والے یورپ کے نظریات میں پوشیدہ زہر کو دیکھ رہے تھے ۔ اور یہ بھی دیکھ رہے تھے ۔ کہ یورپ کی مادی قوت اور شان و شوکت یورپ کے غلاموں اور دیگر پس ماندہ معاشروں کو مرعوب کر رہی ہے ۔ خاص طور پر مسلمانوں کو جو یورپ کے جھوٹے نگوں کو موتی جان کر مہنگے داموں خرید رہے تھے ۔ انھیں جھوٹے نگوں میں یورپ کی پولیٹیکل اکانومی کے نام نہاد ترقی پسند اصول بھی تھے اور انھیں میں لینن اور کارل مارکس کے افکار بھی تھے ، جبھی تو انھوں نے کہا تھا :

عذاب دانش حاضر سے با خبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

وہ قرآنی تعلیمات کے خلاف یونانی افکار کے تجاوزات ہی تھے جن کی طرف شعر ذیل میں تفسیر رازی کو علامت بنا کر اشارہ کیا گیا ہے ۔ ان کا مطلب ہے کہ روح قرآن اور صداقت قرآن کو براہ راست دیکھئے ، یونانی منطق و کلام و فلسفہ سے متاثر مفسرین

و شارحین کی نکتہ آرائیاں اور موشگافیاں ایک طرف رکھ دیجئے

چوں سرمہ رازی را از دیدہ فرو شستم
اسرار جہاں دیدم پنہاں بکتاب اندر

"جب میں نے رازی کا سرمہ آنکھوں سے پونچھ کر صاف کیا تو دیکھا کہ اسرار عالم جملۃً قرآن حکیم کے صفحوں میں مضمر ہیں"

مگر یہ جملہ مطالب جو آدم کو فی الحقیقت آدم بنانے کے ضامن ہیں عقل مغرور کی سمجھ میں نہیں آتے ، یونانی فلسفے اور اس کی موجودہ فکری ذریت کا ایک وصف اور ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ قلب کو کھا جاتی ہے اس لیے کہ وہ عقل ہی کے مشاہدات و فکار کو سب کچھ جاننے لگتی ہے - حضرت علامہ کو عقل سے کوئی عداوت نہیں ، وہ عقل کو اللہ کی بہت بڑی دین اور گراں بہا نعمت جانتے ہیں - وہ عقل کو اللہ کا نور قرار دیتے ہیں ، البتہ ہر شے کی ایک حد ہے ، ایک درجہ ہے ، علامہ کہتے ہیں کہ عقل ہی سب کچھ نہیں ، کوئی اور شے بھی ہے ، جو عقل سے آگے بھی لے جاتی ہے - اور وہ شے قلب ہے ، قلب وجدان کا مصدر ہے اور قلب وحی الہی کا مہبط ہے - عقل کی نظر محدود ہے ، قلب کی نظر غیر محدود ہے -

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

آدم کے مسائل محض مادی نظریات پر پلنے والی دانش یا محض عقل کے بس کا روگ نہیں - آدم محض مادی وجود نہیں - اس کے مادی وجود کی زندگی تو پلک جھپکنے کے برابر ہے - اس کی روحانی زندگانی لافانی ہے - جو شب و روز کے پیمانے سے نہیں ناپی جا سکتی - لہذا خالق ہی کے دستور کے مطابق آدم کی تربیت ہوسکتی

ہے اور وہ دستور بھی خالی عقل کی مدد سے بخوبی نہیں سمجھا جا سکتا -

۱ ”افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا“

”کیا یہ لوگ قرآن کے باب میں غور و تدبر نہیں کرتے ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے دلوں کو قفل لگ گئے ہوں“

سیدھی سی بات ہے کہ آدم اپنا خالق خود نہیں - لہذا ہزار وہ اپنے نفسیاتی اور جوارحی تجزیے کرتا رہے ، ہزار تاریخ ، آثار کا مطالعہ و معائنہ کرے ، ہزار اپنے کمال فن پر تنقید و تبصرہ فرمائے ، حقیقت آدم دسترس سے دور ہی رہے گی -

انسان اندرونی اعتبار سے لا محدود وجود ہے ، اسے وہی جانتا ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے جس کا دعویٰ اور چیلنج ہے -
”الا یعلم من خلق“ کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ؟---
حق یہ ہے کہ وہی جانتا ہے اور اسی کے بھیجے ہوئے نسخۂ کیمیا کی روشنی میں آدم کو ہمہ جہتی تربیت بھی میسر آ سکتی ہے - مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی تسکین اور اطمینان بھی حاصل ہو سکتا ہے ، جہاں قرآن ہی صحیح معنوں میں جہان انسان ہوگا دیکھنا یہ ہے کہ اولاد آدم کب قرآن کے معانی کی روح تک پہنچتی ہے اور کب دنیا میں قرآن نافذ ہوتا ہے - ورنہ آدمی کے اپنے بنائے ہوئے آئین و دستور غیر متوازن اور غیر متناسب ثابت ہوتے رہیں گے ، اور انسانی برادری بار بار وحشت و بہیمیت کی جانب لوٹتی رہے گی ،---انسان اسلامی تعلیمات کی روشنی ہی میں صحیح معنوں میں انسان بن سکتا ہے ، صحیح انسان ہی مسلمان

---

۱ - قرآن حکیم ، سورہ ۴۷ ، آیت ۲۴

ہے ، اور ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیمات کا اہم ترین مصدر قرآن حکیم ہے -

گر تو میخواہی مسلماں زیستن
نسیت ممکن جز بقرآن زیستن

علامہ اقبال اور اجتہاد

علامہ اقبال کے نزدیک تمام پیغمبر ایک ہی دین لے کر آتے رہے ، اس دین کا نام اسلام ہے - وہ دین جب دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روپ میں ظاہر ہوا تو کمال کو پہنچ گیا ، گویا ہر وحی جو رسولوں پر نازل ہوئی آخر کار قرآن کی صورت میں اتمام سے ہمکنار ہوئی - تمام رسولوں کی سیرتیں ، سیرت محمدیہ کے جلوے میں پروان چڑھیں اور یوں انہوں نے معراج و منتہا کو پا لیا ، اب تا قیامت دین محمدی یعنی اسلام کامل بنو آدم کا ضابطہ حیات رہے گا ، اس ضابطہ حیات کا مصدر آخری لفظی وحی یعنی قرآن ہے اور آخری عملی معیار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے -

حیات ایک مسلسل حقیقت ہے ، اس تسلسل میں کہیں انقطاع نہیں ، حضرت علامہ کے نزدیک پوری کائنات ایک وجود نامی (Organism) ہے - جب سے یہاں آدم کا ظہور عمل میں آیا ہے سیرت آدم کا تکمیلی سفر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ رہا - اور تا قیامت سیرت آدم کا یہ سفر جاری رہے گا اس لیے کہ تکمیل سیرت آدم کا نقطہ آخرین حضورؐ ہی کی ذات قدسی صفات ہے ، آپ ہی کا اسوہ ، اسوہ حسنہ ہے اور اسی اسوہ کو اپنا کر بنو آدم اپنی ذات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں -

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بخوبی فہم قرآن ہی کے آئینے میں ممکن ہے ، جس کا مطلب ہوا کہ جوں جوں قرآن کے حقائق کا کشف ہو گا توں توں آپؐ کی رسالت کے معانی و مقامات واضح ہوتے جائیں گے اور مقامات رسالت سے جس قدر زیادہ آگاہی نصیب ہوگی اسی قدر آدم کو روح دین کے سمجھنے میں سہولت ہو گی - بقول علامہ :

دین مسلک زندگی کی تقویم
دین سر محمد و براہیم

دین کا فہم گویا روح محمدؐ و ابراہیمؑ تک رسائی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ روح ابراہیم خود آپ ہی کی ذات میں پہنچ کر کمال یاب ہوئی ، اسی لیے ملت اسلام کا دوسرا نام دین ابراہیمی ہے - عربی میں ملت کا معنی دین ہے اس کا معنی امت نہیں ، ملت ابراہیمی یا دین ابراہیمی کے تکمیلی سفر کو حضرت علامہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت

یہی مضمون یعنی دین اسلام کا ہمہ جہتی فہم در حقیقت روح محمدی تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کا نام ہے)

حضرت علامہ نے ایک خط میں واضح کیا ہے ، یہ خط حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری کے نام مرقوم ہے اور ۱۶ جولائی ۱۹۳۷ء کا مورخہ ہے جس کا مطلب ہے علامہ کی وفات سے تقریباً نو ماہ پہلے کا ، مکتوب الیہ اسلامی ریسرچ کی نیت سے یورپ جانا چاہتے تھے ، علامہ نے منع کیا اور تلقین یہ کی کہ عربی زبان میں مہارت پیدا کر کے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے - مکتوب کے الفاظ یہ ہیں :

"مصر جائیے ، عربی زبان میں مہارت پیدا کیجیئے اسلامی علوم ، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ ، تصوف ، فقہ ، تفسیر کا بغور مطالعہ کرکے محمد عربی کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کیجئے پھر اگر ذہن خدا داد ہے اور دل میں خدمت اسلام کی تڑپ ہے تو آپ اس تحریک کی بنیاد رکھ سکیں گے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہے" [1]

واضح ہوا کہ :

---

۱ - اقبال نامہ ، حصہ اول شیخ ، محمد اشرف ، لاہور ، ص ۳۹۹

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بو لہبی ست

"اپنے آپ کو محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاؤ، اور اگر تم وہاں تک نہ پہنچے تو زندگی ساری ابولہبی کی نذر ہوگئی یعنی کفر میں بسر ہوگئی"

اس مقالے میں ہمارا موضوع بیان اجتہاد ہے اور ظاہر ہے کہ اجتہاد اس عملی ارتقاء کا نام ہے جو فقہ کے باب میں جلوہ گر ہو، رہا یہ فقہ کیا ہے تو علامہ زمحشری کا قول ہے۔

الفقہ حقیقتہُ الشّقّ و الفتحُ [1]

(فقہ کی حقیقت تحقیق و تفتیش کرنا اور کھولنا ہے)

چنانچہ فقیہ وہ ہوا جو

اَلفَقیہ العَالِمُ الذی یشق الاَحکام و یفتش عَن حَقائقھا وَ یفتحُ مَا اَستغلق منھا ۔ [2]

(فقیہ وہ عالم ہے جو تفکر و تدبر کرکے قوانین کے حقائق کا پتہ لگائے اور مشکل و مغلق امور کو واضح کرے)

السیوطی کا قول ہے۔

اَلفقہ مَعقُول من مَنقولَ [3]

(فقہ منقول میں سے سوجھ بوجھ کے ساتھ مطالب و اصول اخذ کرنا ہے)

اگلے صفحے پر مولانا مناظر احسن گیلانی وضاحت کرتے ہیں۔

"فقہ کا یہ معنی نہیں ہے کہ شریعت میں اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ عقل کرتی ہے بلکہ وہی بات یعنی نتائج و

---

۱ - فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، از محمد تقی امینی، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ڈھاکہ، ص ۳۱

۲ - فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، از محمد تقی امینی، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ڈھاکہ ص ۳۱

۳ - تدوین فقہ، مناظر احسن گیلانی - مکتبہ رشیدیہ، لاہور ص ۳۱

احکام کا جو روغن وحی و نبوت کے ان معلومات میں چھپا ہوا تھا عقل کی مشین ان ہی کو اپنی طاقت کی حد تک ان سے نچوڑنے کی کوشش کرتی ہے ۔''

اسی لیے الشیخ محمد الفاضل بن عاشور ، جامعہ زیتونیہ ، تونس لکھتے ہیں :

قد استقر اصطلاح اُصُولیّین علی ان الفقہ ھو الاجتہاد [1]

(اہل اصول یعنی فقہا کی مقرر شدہ اصطلاح یہ ہے کہ فقہ ہی اجتہاد ہے)

J. N. D. Anderson کا بیان ہے

"Islam is a complete way of life, a religion an ethic and a Legal System all in one" 2

(اسلام ایک مکمل اسلوب حیات ہے ، یہ بیک وقت ایک مذہب بھی ہے ، اخلاق بھی ، اور نظام قانون بھی)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی شریعت اسلامی اخلاق اور اسلامی ضوابط کا نام ہے اس کو اینڈرسن ایک اور مصنف کے حوالے سے یوں واضح کرتا ہے :

"(Sharia is) The epitomme of the true Islamic spirit, the most decisive expression of Islamic thought, the essential kernal of Islam)," 3

(شریعت اسلامی فقہ) صحیح اسلامی روح کا خلاصہ ہے ، اسلامی فکر کا انتہائی فیصلہ کن اظہار ، اسلام کا اساسی جوہر)

ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے قانون کا نام اہل اصول کے یہاں فقہ ہے اور اس کا عملی مظہر شریعت

---

۱ - الندوہ العالمیہ الاسلامیہ - مطبعہ جامعہ پنجاب - ص ۲۶

Islamic Law in the Modern World (London), 1959. - 2

Islamic law in the modern world (London) 1959 , PX

ہے ، یہی باعث ہے کہ اسلام کا تقدس شریعت اور فقہ کی جان ہے، اور اینڈرسن کے بقول اسلامی ضابطوں کا محض جرم و سزا ہی سے تعلق نہیں ۔ اس کے ساتھ عذاب و ثواب بھی وابستہ ہے ۱ اور اسی حقیقت کو محمد نقی امینی بالفاظ ذیل بیان کرتے ہیں :

قانون کے ثبات و بقا کے لیے عظمت و تقدس کے بغیر چارہ نہیں ۲

H.A.R. GIBB بھی اسلامی ضوابط کے تقدس کو تسلیم کرتا ہے :

چنانچہ لکھتا ہے :

"For the early Musims there was little or no distinction between Leagal and Religious' 3

(ابتدائی مسلمانوں کے نزدیک دینی اور قانونی امور کے مابین بہت کم فرق تھا یا کوئی فرق تھا ہی نہیں) ضوابط شریعت کی اس عظمت کی اینڈرسن نے بھی تائید کی ہے چنانچہ مسلمانوں میں فقہ کو جو تقدس حاصل ہے وہ اس کے ضمن میں تحریر کرتا ہے :

".....It is not society that influences law, but the law that provides a divinely revealed norm and standard to which Muslim society is under a perpetual duty to conform" 4

(یہ سوسائٹی نہیں جو قانون کو متاثر کرتی ہو بلکہ یہ قانون ہے جو وحی کردہ ایک ایسا قاعدہ اور معیار مہیا کرتا ہے جس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا مسلمان سوسائٹی پر دواماً فرض ہے)

---

1 - Islamic Law in the modern world, (London), P , 4

۲ - فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ، ص ۴۲

3 - Muhammadanism-A Historical survey, London -1961 , P , 90

4 - Islamic Law in the Modern World , P , 7

اینڈرسن نے جس امر کی جانب اشارہ کیا ہے اس کی تائید اور بھی مستشرقین نے کی ہے در حقیقت فقہ اسلامی نے جس کے اساسی ضوابط قرآن کریم کے مبادیات پر استوار ہیں مسلمانوں کو ایک طرح سے یکساں رویے کا مالک بنا دیا ، یہ چیز خود مسلمانوں کو محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کا معمول حیات ہے ، غیروں کو یہ چیز بالوضاحت محسوس ہوتی ہے ۔

مسلمانوں میں فقہ یا یوں کہیے کہ ان کے یہاں ضوابط و قواعد نے ان کی زندگی کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ جملہ شعبہ ہائے حیات میں ایک ربط و تعلق نمایاں طور پر موجود ہے ۔ انداز حیات کی یہ ہم آہنگی ہر مسلم سوسائٹی میں موجود ہے لہذا مسلمان سوسائٹیاں خواہ وہ کہیں بھی ہوں ایک ہی سانچے میں ڈھلی دکھائی دیتی ہیں ۔ یہاں Wilfred Cantwell Smith کا حوالہ بیجا نہ ہوگا۔ سمتھ کا قول ہے :

"Islamic form was given to almost every aspect of life, whatever its content. And it was an Islamic pattern that gave the society cohesion as well as vitality. The centre of this unifying force was Religious Law, which regulated within its powerful and precise sweep everything from prayer rites to property rights. The Law gave unity to Islamic society from Cordova to Multan. It gave unity also to the individual Muslim. His entire life activity being organised into a meaningful whole by this divine pattern" 1

(زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو خواہ کسی بھی موضوع سے متعلق تھا اسلامی رنگ میں رنگ دیا گیا تھا ۔ اور یہی وہ اسلامی ڈھانچہ تھا جس نے اسلامی معاشرے کو ہم جہتی بھی عطا کی اور زور اور ولولہ بھی ۔ اس وحدت آموز قوت (توحیدی قوت) کا مرکز وہ دینی ضابطہ و آئین تھا جو اپنے طاقت ور اور صریح ولولے کے جلو میں ہر بات کو نظم و ترتیب سے نواز رہا تھا ۔ عبادات سے لے کو حقوق ملکیت تک سب معاملات

1. Islam in Modern History, paper-back,1959. P. 37.

اسی کے زیر اثر تھے ۔ اسلامی آئین (فقہ) نے مسلمان معاشرے کو قرطبہ (ہسپانیہ) سے لیکر ملتان تک وحدت بخش رکھی تھی ، یہی نہیں بلکہ اس نے مسلمان فرد کو بھی (خود اس کی ذات میں) وحدت سے نواز رکھا تھا ، اس لیے کہ کی ساری زندگی کو اس پاکیزہ سانچے نے عملاً منضبط منظم کرکے ایک با معنی اور بھر پور کل بنا دیا تھا)

ایک خدا ، ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ایک قانون اور ضابطہ ، امت مسلمہ کی توحیدی روح ہے ، اور یہ وہ بات ہے جس کو حضرت علامہ امت میں تلاش کرتے ہیں ۔

ملت ازیکرنگئی دلہا ستے
روشن ازیک جلوہ ایں سینا ستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے
مدعائے ما مآل ما یکے ست
طرز و انداز و خیال ما یکے ست

قدرتی امر ہے کہ علامہ اقبال جو مسلمانوں کی شخصی وحدت کے بھی متمنی تھے اور اجتماعی توحید کے بھی وہ جانتے تھے اور یہ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام آخری ضابطہ حیات ہے اور اسے تاحشر انسانی معاشروں کی راہنمائی اور روح افزائی کا فریضہ سرانجام دینا ہے لہذا اصل روح کو بحال رکھتے ہوئے فقہ اسلامی کو ہر زمانے کا ساتھ دینا ہو گا ، اسلام میں یہ کمال ہونا چاہیے ۔

حضرت علامہ کہتے ہیں :

ظاہر او انقلابے ہر دمے
باطن او از تغیر بے غمے

سمتھ کا جو اقتباس اوپر مندرج ہوا اس میں ایک نہایت پتے کی بات بتائی گئی ہے وہ یہ کہ فقہ نے فقط اسلامی سوسائٹی ہی

کو نہیں فرد کو بھی وحدت سے نواز رکھا تھا یہ بڑی گہری سچائی ہے - تشریح یہ ہے کہ جس شخص کا کوئی نقطہ ایمان ایسا نہ ہو جو اس کی شخصیت کو مرکزیت عطا کر سکے تو وہ شخص ایک شخص نہیں ہو سکتا - یقین کی مرکزیت سے محروم شخص ، شخصاً ایک ہوتا ہے مگر اس کی شخصیت ایک نہیں ہو سکتی اور اگر شخصیت ایک نہ ہو تو تکمیل شخصیت کیسے عمل میں آئے جس کا مطلب ہے کوئی فرد اپنی خودی تک کیونکر رسائی حاصل کر سکے - تربیت خودی تو ''توحید،، کے رگ و پے میں سرایت کر جانے کا نام ہے ، اور یہ امر اس وقت تک ممکن الوقوع نہیں جب تک ضابطہ و قاعدہ حیات میں ایک مرکز کے حوالے سے ربط موجود نہ ہو ، وہ مرکز خدا ہے ، اس مرکز کا ہر پر تو محسوس حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہے جسے فقہی اصطلاح میں ''سُنّت،، کہتے ہیں - قران و سنت کی روح سے سرشار جملہ امور کا عمل بن جانا شریعت ہے - شریعت ہی کا اصولیین کے یہاں دوسرا نام فقہ ہے ، چنانچہ اسلام کی اس روح زندہ سے حضرت علامہ کی دلچسپی شدید تھی ، فقہ کا بیدار و طیار رہنا گویا اسلام کی حقیقی قوت ہے -

اس حقیقت کے احساس شدید کے باعث حضرت علامہ کی دلی تمنا تھی کہ وہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں قرآن کے مطالب قلمبند کریں - مثلاً ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء کو انہوں نے سر راس مسعود کے نام مرقوم ایک خط میں اظہار کیا :

''چراغ نہ سحر ہوں،، بجھا چاہتا ہوں ، تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں ، جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جد امجد (حضور نبی کریم ؐ) کی زیارت مجھے اس

اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضور نے ہم تک پنچایا کوئی خدمت بجا لا سکا ،، ۱

ستمبر ۱۹۳۷ء میں یعنی وفات سے سات ماہ قبل سیدین صاحب کے نام تحریر کردہ خط میں بھی اس حسرت کا بیان ہے ،

،،ضعف بصارت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے ، میری خط و کتابت احباب کرتے ہیں یا کبھی جاوید میاں سے خطوط کے جواب لکھوا لیتا ہوں ۔ اسلامی اصول فقہ کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ تھا لیکن اب امید موہوم نظر آتی ہے ،، ۲

اسی ضمن میں میاں محمد شفیع لکھتے ہیں :

،،وہ (حضرت علامہ) انگریزی زبان میں اسلام کے مطالعہ کے لیے ایک دیباچہ قلمبند کرانا چاہتے تھے جس میں اسلام کے فلسفہ قانون پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی جاتی ۔ چونکہ ان کی بینائی روز بروز کم ہوتی چلی جا رہی تھی اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ وہ یہ کتاب مجھے تحریر کرواتے جاتے ، اگر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو انگریزی زبان میں اسلامی نظام حکومت ، معاشرت اور فلسفہ اسلامی قانون کے متعلق ایک مستند ترین اور آخری کتاب ہوتی ،، ۳

وہ کتاب یقیناً کوئی ایسی ہی شے ہوتی ، خود حضرت علامہ کے الفاظ اس کتاب موعود کے باب میں یہ تھے ۔

،،میں نے اپنے خیالات کا بڑی تفصیل سے اشعار میں اظہار کر دیا ہے ۔ لیکن ابھی میرے دل میں ان سے بھی بڑی چیز ہے

۱۔ اقبال نامہ ، حصہ اول ، مرتبہ شیخ عطا اللہ ، شائع کردہ شیخ محمد اشرف ، لاہور ، ص ۳۶۱ ، ۲۶۲

۲۔ ایضاً ، ص ۳۲

۳۔ اقبال اور مسئلہ تعلیم ، محمد احمد خان ، اقبال اکیڈیمی لاہور ، ص ۳۹۲

جسے قرآن حکیم کی شرح کی صورت میں ظاہر کرنے کی آرزو رکھتا ہوں ،، [۱]

یہ الفاظ حضرت علامہ نے اپنے دوست خواجہ عبدالوحید صاحب سے اکتوبر ۱۹۳۴ء میں کہے تھے - یہی وہ کتاب تھی جس کے قلمبند کرانے کی خاطر رأس مسعود کے توسط سے نواب صاحب بھوپال نے ۱۹۳۵ء میں حضرت علامہ کا ۵۰۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر فرمایا تھا تاکہ آپ وکالتی دھندوں سے فارغ الذھن ہو کر اس کتاب کی تصنیف کی جانب متوجہ ہو سکیں مگر صحت نے ساتھ نہ دیا ، یہ آرزو شکست یاب ہو کر حسرت بن گئی - جسے علامہ اپنے ساتھ عالم عدم میں لے گئے -

اسلامی فقہ سے ان کی دلچسپی زندگی کے آخری سالوں ہی میں پیدا نہ ہوئی تھی سید سلیمان ندوی کے ساتھ جو مکاتبت ہوئی اس میں بھی کئی خطوط میں فقہی مسائل زیر بحث رہے ، کوئی خط ۱۹۲۴ء میں تحریر ہوا - کوئی ۱۹۲۵ء اور کوئی ۱۹۲۶ء میں مثلاً مارچ ۱۹۲۶ء میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے اس مبعث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی ہے جو میری نظر سے گزری ہے مگر افسوس کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے - اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا - موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا - میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود

۱- ملفوظات اقبال ، اقبال اکیڈیمی لاہور ، ص ۱۷۴

مطمئن نہیں اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا ،، [۱]

حضرت علامہ نے مکتوب بالا کے بعد اپریل ۱۹۲۶ء کے ایک مکتوب میں بھی اپنے رسالہ اجتہاد کا ذکر دھرایا ہے ، معلوم یہ ہوتا ہے کہ علامہ نے اجتہاد کے باب میں جن خیالات کا ذکر کیا سید سلیمان ندوی نے گمان کیا کہ شاید عبادات بھی اجتہاد کی زد میں آ گئی ہیں یا آ سکتی ہیں ، اس غلط فہمی کا ازالہ حضرت علامہ نے بدیں الفاظ کیا ۔

''عبادات کے متعلق کوئی ترمیم و تنسیخ میرے پیش نظر نہیں بلکہ میں نے اپنے مضمون اجتہاد میں ان کی ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے کی کوشش کی ہے ، ہاں معاملات کے متعلق بعض سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں ۔ اس ضمن میں چونکہ شرعیت احادیث (وہ احادیث جن کا تعلق معاملات سے ہے) کا مشکل سوال پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور ابھی تک میرا دل اپنی تحقیقات سے مطمئن نہیں ہوا ۔ میرا مقصود یہ ہے کہ زمانہ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں ،، [۲]

اسی مکتوب میں چند سطور آگے چل کے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ فقہ کی تجدید کے باب میں ایسے تجدد پسند نہیں کہ ماضی سے کٹ کر رہ جائیں انہیں ماضی ساتھ چلتا ہے :

زمانہ ایک ، حیات ایک ، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

چنانچہ علامہ لکھتے ہیں :

۱۔ اقبال نامہ ، جلد اول ، ص ۱۴۲ ، ۱۴۳
۲۔ اقبالنامہ جلد اول ، ص ۱۴۶ ، ۱۴۷

''میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں ''قدیم،، ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ ''جدید،، بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیمیافتہ لوگوں کے دونوں طبقے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں،،

چند سطور مزید آگے جا کے اسی مکتوب میں علامہ نے ایک دو فقہی مسائل سے تعرض کیا ہے :

''آپ کے خط کے آخری حصے سے ایک سوال میرے دل میں پیدا ہوا ہے اور وہ یہ کہ آیا امام کو اختیار ہے کہ قرآن کی کسی مقرر کردہ حد (مثلاً سرقہ کی حد) کو ترک کر دے ، اور اس کی جگہ کوئی اور حد مقرر کر دے اس اختیار کی بنا کونسی آیت قرآنی ہے ، حضرت عمرؓ نے طلاق کے ضمن میں جو مجلس قائم کی تھی اس کا اختیار ان کو شرعاً حاصل تھا ۔ میں اختیار کی اساس معلوم کرنا چاہتا ہوں ۔ زمانہ حال کی زبان سے یوں کہیے کہ آیا اسلامی کانسٹی ٹیوشن ان کو ایسا اختیار دیتی تھی ۔ امام ایک شخص واحد ہے ، یا جماعت بھی امام کی قائم مقام ہو سکتی ہے ۔ ہر اسلامی ملک کے لیے اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک واحد امام ، مؤخر الذکر صورت موجودہ فرق اسلامیہ کی موجودگی میں کیونکر بروئے کار آ سکتی ہے،،

اسی دوران میں یعنی جس زمانے میں حضرت علامہ کی مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ فقہی مسائل پر خط و کتابت ہو رہی تھی صاحب زادہ آفتاب احمد خان وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے اسلامی تعلیم سے متعلق ایک خاکہ تیار کرایا تھا اور وہ حضرت علامہ کی خدمت میں بھی رائے دہی کے لیے بھجوایا گیا تھا ، حضرت علامہ نے ۴ جون ۱۹۲۵ء کو ایک طویل خط کے ذریعے اس خاکے

کی مختلف شقوں پر اظہار خیال کیا ، یہ خط علامہ کے تعلیمی نظریات پر خاصی دلچسپ روشنی ڈالتا ہے ، کئی پیرے ہیں ، ایک حصہ فقہ اسلامی سے بھی تعلق رکھتا ہے محمد احمد خان نے حضرت علامہ کا عندیہ یوں بیان کیا ہے :

''اسلامی فقہ کی تشکیل جدید کی جائے ۔ یہاں فقہ سے مراد وہ نہیں جو عام طور پر لی جاتی ہے جس طرح اقبال دینیاتی اور کلامی مسائل کے لیے تفکر اسلامی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اسی طرح فقہ سے ان کی مراد روزے ، نماز وغیرہ کے احکام نہیں بلکہ اسلام کے جملہ اجتماعی (عمرانی) پہلوؤں (مثلاً سماجی ، سیاسی اقتصادی و قانونی) کی تعلیم مراد ہے یعنی وہ چاہتے ہیں کہ دور جدید کے تمام عمرانی علوم (Social Sciences) کے مطالعہ کی روشنی میں اسلام کے اجتماعی (عمرانی) اصول و احکام یا بالفاظ دیگر اسلام کے اجتماعی نظم کی توضیح و تشریح کی جائے'' [1]

فقہ سے ان کی دلچسپی واضح ہے ، اور فقہ کو معاصر احوال پر منطبق ہونے کے لائق بنانا اجتہاد ہے ۔ حضرت علامہ نے ۱۹۲۶ء میں کوئی رسالہ اجتہاد کے موضوع پر مرتب بھی کیا تھا جس کا ذکر سطور بالا میں گزر چکا ہے ۔ اور جسے حضرت علامہ نے بوجوہ شائع نہ کرایا بہرحال وہ خواہاں تھے کہ اسلام کے اساسی اصولوں کی غیر متبدل روح کو پیش نظر رکھ کر ہر زمانے میں ابھرنے والے سوالوں کا جواب دیا جائے ۔۔۔یہ مباحث یوں محسوس ہوتا ہے گویا مدراس میں دیئے جانے والے خطبات اور خصوصاً چھٹے خطبے کی تمہیدی یا پس منظری تعاونات تھے ۔

حضرت علامہ کے چھٹے خطبہ مدراس کا عنوان ہے ۔
'' The principle of movement in the structure of Islam. ''

---

۱ ۔ اقبال اور مسئلہ تعلیم ، ص ۲۰۷

اور محترم سید نذیر نیازی صاحب نے اس کا لبابی ترجمہ فرمایا ہے ''الاجتہاد فی الاسلام،، اس خطبے کا آغاز اس اعلان سے ہوتا ہے کہ قدیم مذاہب کے خلاف از روئے اسلام کائنات ساکن نہیں - یہ وہی بات ہے جو بعد میں ساقی نامہ میں بیان ہوئی -

ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ تازہ ہے شان وجود

ساتھ ہی یہ فرمایا کہ بنو آدم خاک سے وابستہ نہیں اور وابستہ اس لیے نہیں کہ ان کے وجود کا سرچشمہ روحانی ہے - نیز یہ کہ وہ سرچشمہ ایک ہی ہے اس حقیقت کی بنا پر بنو آدم کو رنگ و نسل اور جغرافیائی نسبتوں کے حوالے سے تقسیم نہیں کیا جا سکتا - اسلامی تہذیب عقیدہ توحید پر استوار ہے - وحدت آدم کو عمل میں لانا گویا فعال توحید ہے اس توحیدی تہذیب کی وفاداریاں قدیم تہذیبوں میں کار فرما وفاداریوں سے مختلف ہیں اس تہذیب کی وفاداریاں شاہوں کے تاج و تخت کے ساتھ نہیں بلکہ احکام خدا وندی کے ساتھ ہیں اور چونکہ کائنات کی روحانی اساس ذات خدا وندی ہے اس لیے عقیدہ توحید پر عمل پیرا ہونا عین فطرت انسانی کی اطاعت ہے جس سے حضرت علامہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدائے واحد پر یقین کامل کی صفت کے بغیر اپنی اصل فطرت تک رسائی حاصل کر ہی نہیں سکتا - پھر چونکہ کائنات کا ہر لحظہ متغیر ہے اور خالق کائنات اور اس کے بنیادی احکام و اصول قائم و دائم ہیں لہذا بنو آدم میں اجتماعی اور انفرادی استحکام کے ظہور کی شرط یہ ہے کہ وہ غیر متغیر اصل کو بھی نہ چھوڑے اور زمانے کی ہر لحظہ تازگی کا بھی حریف دل جو ثابت ہو - حریف تازگی ہونے کے لیے اصول فقہ کے نتائج کی تازہ تعبیر ضروری ہوگی - اس تازہ تعبیر کی راہ میں صرف ہونے

والی مشقت کا نام اجتہاد ہے ۔

ڈاکٹر صبحی محمصانی کے نزدیک اجتہاد کے لغوی معنی امکانی کوشش کے ہیں ۔ اور اصطلاح شرع میں اس امکانی کوشش کے صرف کرنے کا نام ہے جو دلائل شرعیہ کے ذریعے استنباط احکام کے لیے کی جائے ۔ بالفاظ دیگر وہ کوشش جو مذکورۃ الصدر اصول اساسی کی وساطت سے احکام شرع کے استخراج کے لیے کی جائے ۔ ۱

مولانا ثناء اللہ امرتسری جمع الجوامع لابن السبکی (جلد دوم ص ۔ ۲۵۱) کے حوالے سے اجتہاد کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

وَاَخذ القول الغیر مع معرفۃ دلیلہ فھو اجتہاد وافق اجتہاد القائل ۔ ۲

(کسی قول کو دلیل کے ساتھ پہچان کر قبول کرنا یہ اجتہاد ہے جو قائل اول کے اجتہاد سے موافق ہے) ۔

اس اعتبار سے بقول مولانا ثناء اللہ امرتسری مجتہد کی تعریف یہ ٹھہری :

"جو لوگ علم اصول کے استنباطی قواعد سے واقف ہیں اور مسائل کو دلائل سے جانتے ہیں وہ مجتہد ہیں ۔ ۳

اجتہاد کی تعریف سے متعلق حضرت علامہ کے انگریزی کلمات کا جو ترجمہ سید نذیر نیازی صاحب نے کیا ہے وہ یہ ہے ۔

"لغوی اعتبار سے تو اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا ، لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے

---

۱ ۔ فلسفہ التشریع فی الاسلام ، ترجمہ از مولوی محمد احمد رضوی ، مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۱۴۷

۲ ۔ رسالہ اجتہاد و تقلید از مولانا ثناء اللہ امرتسری ، اہل حدیث اکادمی کشمیری بازار ، لاہور۱۹۶۸ء ، ص ۱۵

کی جائے ۔ [۱]

ساتھ ہی حضرت علامہ نے اس آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے

''وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا،، (سورہ ۲۹ ، آیت ۶۹)

(جو لوگ ہماری خاطر مشقت اٹھائیں گے ہم انھیں اپنی راہیں حتماً اور لازماً دکھائیں گے) خواہ قرآن کریم میں اس آیت کا محل کچھ بھی ہو مگر بہرحال اجتہاد بھی ایک مشقت ہے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اجتہاد، توضیح و توسیع قانون کی راہ میں جہاد ہے اس لیے مجتہد اللہ کی ہدایت سے محروم نہیں رہتا۔۔۔پھر یہیں وہ مکالمہ بھی مندرج ہے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت معاذ بن جبل کے مابین عمل میں آیا تھا ۔ حضرت معاذ کے جواب کا مخلص یہ تھا کہ اگر کسی امر کا فیصلہ کرنے کے ضمن میں انھیں قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی میسر نہ آئی تو پھر وہ خود اپنی رائے سے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے ۔ حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کے اس جواب کی تحسین فرمائی تھی ۔

یہاں ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت شرع کی روشنی میں استنباط احکام کی روح فقہ میں بھی کار فرما ہے اور اجتہادمیں بھی، حضرت معاذ کےپیش نظر کوئی فقہ نہ تھی جس میں وہ اجتہاد کرتے لہذا ان کا عمل فقہ بھی تھا اور اجتہاد بھی ۔ الشیخ محمد الفاضل بن عاشور جامعہ زیتونیہ تونس کی رائے آغاز مقالہ میں درج کی جا چکی ہے ۔

''قد استقرا اصطلاح الا صولین علی ان الفقہ ھو الاجتہاد،،

مسئلہ تو یہ ہے کہ احکام کے استنباط میں عقل و دلیل سے کام لے کر حسب صورت احوال کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش

۱- نشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۲۲۸

کی گئی یا نہ ، اس ضمن میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کا قول دلچسپی سے خالی نہیں ۔ آپ نے فرمایا

"حرام علی من لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی" [۱]

(جو شخص میرے کلام کی دلیل نہ جانے اسے میرے قول پر فتویٰ دینا حرام ہے) اگر یوں دیکھا جائے تو کوئی بھی مفتی اور فقیہہ مقلد نہیں رہتا ۔ بہرحال اس مسئلے کا مفاد کچھ اور ہے ۔

حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ فتوحات اسلامی کے ساتھ ساتھ نئے نئے مسائل نے سر اٹھایا ۔ چنانچہ فقہا نے خوب محنت صرف کی ۔ ضابطے اور قاعدے مرتب کئے مسائل کے حل تجویز کئے جو ہوتے ہوتے چند مستقل مذاہب کی صورت میں معین ہوگئے ..

علامہ کی رائے میں ان فقہی مذاہب کے یہاں اجتہاد کے تین درجے ہیں ۔

(۱) تشریع یا قانون سازی کی مکمل آزادی ۔ جس سے فقط بانیان مذاہب نے فائدہ اٹھایا ۔

(۲) محدود آزادی جو کسی مذہب کی حدود کے اندر ممکن ہو ۔

(۳) وہ مخصوص آزادی جس کا تعلق کسی ایسے مسئلے سے ہو جسے موسیسن مذاہب نے جوں کا توں چھوڑ دیا ہو ۔ یہاں علامہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بحث شق اول تک ہی محدود رکھی ۔ [۲]

اس ضمن میں حضرت علامہ وضاحت کرتے ہیں کہ علمائے سنت و جماعت اصول اور نظریئے کے طور پر اس امر کے قائل ہیں کہ اجتہاد ہونا چاہیئے مگر انھوں نے اس ضمن میں شرائط ایسی عائد کر رکھی ہیں جن کا پورا کرنا اگر نا ممکن نہیں تو محال ضرور ہے ۔ یہاں حضرت علامہ بعض متشرقین کی اس رائے یا الزام

---

۱ ۔ رسالہ اجتہاد و تقلید ، ص ۵۱

۲ ۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ، ص ۲۲۸

کی تردید کرتے میں کہ اجتہاد کی راہ ترکوں کے اثر سے بند ہوئی حضرت علامہ وضاحت کرتے ہیں کہ ترکوں کا اثر شروع ہونے سے قبل حرکت فقہ میں جمود رونما ہو چکا تھا ۔ بہرحال حضرت علامہ کے نزدیک فقہ و اجتہاد کے باب میں جو بندش در آئی اس کے چند اسباب بھی تھے ۔

(۱) بنو عباس کے دور میں فروغ پانے والی تعقلیت نے بعض ایسے مسائل کھڑے کر دیئے تھے جن کے نتائج آگے چل کر بڑے خطرناک ہوتے ، مثلاً خلق قرآن کا مسئلہ علما و فقہائے امت کو (خواہ بر بنائے غلط فہمی) خوف لاحق ہوا کہ نظام ایسے متکلمین کی حد سے بڑھی ہوئی بے باک کلامی بحثیں کہیں امت کے فکری انتشار کا باعث نہ بن جائیں ۔ اس ڈر کے مارے انھوں نے فقہ و اصول میں اور بھی زیادہ تشدد پیدا کر لیا تاکہ اسلامی سوسائٹی کا ڈھانچہ بحال رہے ۔

(۲) متکلمین اور فقہا کی عقلی و فقہی موشگافیوں سے بیزار ہوکر ایک گروہ الگ ہو بیٹھا وہ گروہ غیر اسلامی موثرات سے متاثر تھا ۔ یہ اہل تصوف کا گروہ تھا ۔ علامہ کہتے ہیں کہ تصوف کو عقلین کے خلاف ایک طرح کی بغاوت قرار دیا جا سکتا ہے ۔ علامہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سوسائٹی کے عالی دماغ لوگوں نے تصوف کے دامن میں پناہ لے لی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اصول و قانون کا شعبہ متوسط درجے کے افراد علم عقل و کے قبضے میں چلا گیا ۔

(۳) سقوط بغداد سے مسلمانوں کو شدید دھچکا لگا ۔ اور اس کے جلو میں آنے والی تباہی و بربادی نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر اسلامی سوسائٹی اور دین کے مستقبل کے باب میں نیم مایوسی کا سایہ ڈال دیا ۔ نتیجہ یہ کہ فکری قویٰ میں اضمحلال بڑھا اور انتشار بھی ، سوسائٹی کے مزید فکری اور ذہنی انحطاط کو روکنے کی خاطر قدامت پسند علما کو ضوابط و قواعد کی

مزید متشددانہ تعیین کی ضرورت محسوس ہوئی - حضرت علامہ خود بھی اس صورت حال میں ایک حد تک اس رویے کی تائید کرتے ہیں مگر ساتھ ہی جس امر پر زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ

"قوائے انحطاط کا سدباب نظم و ربط ہی سے ہوتا ہے لیکن وہ نہیں سمجھے اور ہمارے زمانے کے علما نہیں سمجھتے کہ قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دار و مدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے بلکہ اس بات پر ہے کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں قدرت اور صلاحیت کیا ہے - یوں بھی جب معاشرہ حد سے زیادہ منظم ہو جائے تو اس میں فرد کی ہستی سرے سے فنا ہو جاتی ہے - وہ اپنے گرد و پیش کی اجتماعی اقدار کی دولت سے تو مالا مال ہو جاتا ہے لیکن اپنی حقیقی روح کھو بیٹھتا ہے" [1]

بہرحال تنظیم کا معنی جمود نہیں ہونا چاہیے وفقہی مدارس جب اپنی اپنی جگہ منظم ہوگئے اور سکہ بند صورت اختیار کر گئے تو یہ امر بھی ایک طرح سے اجتہاد کی در بندی کا باعث بن گیا - ویسے بھی روحانی قویٰ کے دور اضمحلال میں ولولہ کار اور ذوق جستجو کمزور پڑ جاتا ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مسلک یا مذہب کے سربراہ ایسے تقدس مآب ٹھہرائے جانے لگتے ہیں کہ گویا انہیں بتوں کا منصب حاصل ہوگیا ہو -

اس جمود کے خلاف تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت امام ابن تیمیہؒ نے اور سولھویں صدی میں حضرت امام السیوطیؒ نے آوازہ بلند کیا - حضرت علامہ نے اقبال امام ابن تیمیہ کو ان کے جوش و ولولہ کی داد دی ہے - تاہم ان کا خیال ہے کہ امام ابن تیمیہ کا نقطۂ نظر بھی چونکہ غیر تنقیدی ہے لہذا انہوں نے قانونی امور میں دارو مدار احادیث پر رکھا - امام السیوطی نے

۱- تشکیل جدید الہٰیات اسلامیہ ، ص ۲۳۲ ، ۲۳۳

بھی اجتہاد کی بھر پور حمایت کی بلکہ وہ تو اس امر کے قائل تھے کہ ہر صدی کسی مجدد کی محتاج ہے - وہابی تحریک ظاہر ہے کہ امام ابن تیمیہ کی تحریک کا روشن ثمرہ تھی - علامہ اقبال اٹھارویں صدی کی اس تحریک کی بھی اس ضمن میں کہ اجتہاد کا در بند نہیں - تائید کرتے ہیں ، مگر وہی بات دہراتے ہیں کہ وہابی تحریک کا رویہ ماضی کے باب میں غیر ناقدانہ رہا - علامہ کے نزدیک احیا سے مراد فرسودگی اور جمود کا احیا نہیں -ترکوں کے تجدد کو زیر بحث لاتے ہوئے علامہ نے کہا :

"پھر اگر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ناگزیر ہے جیسا کہ میرے نزدیک قطعی ہے تو پھر ہمیں بھی ترکوں کی طرح ایک نہ ایک دن اپنے عقلی اور ذہنی ورثے کی قدر و قیمت کا از سر نو جائزہ لینا ہوگا - [1]

ترکوں کی دو بڑی سیاسی پارٹیاں تھیں "حزب قومی" اور "حزب اصلاح مذہب" حزب قومی نے اسٹیٹ اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا - یہ خالص مغربی تصور قومیت تھا - ظاہر ہے کہ علامہ اس سے متفق نہیں ہو سکتے تھے ، سیاست اور مذہب میں جدائی روح و بدن میں جدائی کی مثیل ہے - حالانکہ اصلاً دونوں ایک ہیں - روح کو زمان و مکاں کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ مادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس وحدت سے انسان عبارت ہے جب اس کے اعمال و افعال کا مشاہدہ عالم خارجی کے حوالے سے کیا جائے تو ہم اسے بدن کہیں گے - لیکن جب اعمال و افعال کی غرض و غایت اور نصب العین پر نظر رکھی جائے تو ہم اس کو روح کہتے ہیں -

سعید حلیم پاشا کا تعلق حزب قومی کے برعکس حزب اصلاح مذہب سے تھا - سعید حلیم پاشا کو محمود شوکت پاشا کے بعد

۱- تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ، ص ۲۳۶

انور بیگ کی حکومت کے دوران میں منصب وزارت عظمیٰ حاصل ہوا تھا ۔ سعید حلیم پاشا کی رائے میں ترکی شہنشاہی کا احیاء شریعت کی بحالی اور اجتہاد ہی سے ممکن تھا ۔ مشہور ترکی شاعر محمد عاکف بھی سعید حلیم پاشا کا ہم خیال تھا ۔ اور یہ محمد عاکف وہی ہے جسے ترکی جمہوریہ کا قومی ترانہ قلمبند کرنے کا شرف حاصل ہوا ۔ [۱]

سعید حلیم پاشا کے ملی افکار کو حضرت علامہ جس قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے وہ جاوید نامہ سے ظاہر ہے ۔ حضرت علامہ کی رائے میں سعید حلیم پاشا نے اس بنیادی حقیقت پر زور دیا ہے کہ اسلام میں عینیت اور اثباتیت دونوں کا امتزاج نہایت خوبی سے ہوچکا ہے یوں بھی اس نے حریت ، مساوات ، اور استحکام کی ابدی صداقتوں کو چونکہ ایک وحدت میں سمو دیا ہے لہذا اس کا کوئی وطن نہیں ، پھر جیسے نہ تو کوئی انگریزی ریاضیات ہے ، نہ فرانسیسی کیمیا ، اسی طرح نہ کسی ترکی اسلام کا وجود ہے نہ عربی اور ہندی اسلام کا [۲]

اصل بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ حق اجتہاد کس کو حاصل ہے ؟ فرد کو یا جماعت کو ؟ ۔ ترکوں نے یہ اجتہاد کیا کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے یا اسلامی تعلیمات کی روح کے مطابق اس منصب کو افراد کی ایک جماعت بلکہ منتخب شدہ مجلس کے سپرد بھی کیا جا سکتا ہے ۔ علامہ اقبال اس طریق اجتہاد کو درست قرار دیتے ہیں ۔ علامہ اس طریق کو اس لیے درست قرار دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ طرز عصر حاضر میں بحالی جمہوریت کے لیے ناگزیر تھا ۔ مگر علامہ اقبال تاکید کرتے ہیں کہ علما کا بھی ایک گروہ اسمبلی میں شامل ہونا چاہیے ۔ جو دین

۱- Islam and Secularism in Post Kemalist Turkey, Muhammad Rashid Feroze, I. R. I. Islamabad, P. 48, 49

۲- تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ، ص ۲۴۱

سے متعلق زیر بحث آنے والے مسائل اور ان کے ضمن میں رو پذیر ہونے والے ضوابط و قواعد کا جائزہ لیتے رہیں - یہاں حضرت علامہ نے ایرانی دستور کی مثال دی جس کی رو سے مجلس قانون ساز پر ایک مجلس علماء نگران تھی - ساتھ ہی علامہ نے خدشہ بھی ظاہر کیا کہ علماء کی یہ مجلس خطرناک بھی ہو سکتی ہے - حضرت علامہ کے مزاج میں توازن کاری کا جوہر ایسا رچا ہوا تھا کہ وہ معاشرتی زندگی کے ہر عنصر کو متناسب و متوافق دیکھنا چاہتے تھے - میزان ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی - وہ ہر شے کے محاسن و مصائب پر بیک وقت نظر رکھتے ہیں -

جدید ترک عالمگیر خلافت کے تصور کو عملاً ممکن و کامگار نہیں جانتے تھے - گویا وہ ضیاء گو کلپ کے ہمنوا تھے کہ عالم اسلام کی یکجہتی کے لیے ضروری ہے کہ مسلم اقوام جہاں جہاں ہیں وہاں وہاں آزاد ہوں اور قوت حاصل کریں - مختلف قومی اسلامی وحدتوں میں جب روحانی قرب نمودار ہوگا تو اتحاد عمل میں آجائے گا - اتحاد محض ایک نمائشی خلیفہ کے تقرر سے عمل میں نہیں آ سکتا - [۱]

حضرت علامہ نے ضیاء کے ان خیالات کا بھی ذکر کیا ہے جن میں اس نے اذان و نماز کے ترکی زبان میں تبدیل کیے جانے کی افادیت پر فخر کا اظہار کیا تھا - علامہ نے اس اجتہاد کو قابل اعتراض قرار دیا - ہاں انھوں نے اس باب میں ابن تومرت کی مثال دے کر واضح کر دیا کہ اس طرح کی ایک کارروائی عہد ماضی میں بھی ظہور پذیر ہوئی تھی - ابن تومرت نے بھی کبھی اپنی مملکت میں قرآن و آذان کو بربری میں رواج دینے کی کوشش کی تھی تاکہ ان پڑھ بربری سوچ سمجھ کر عبادت کر سکیں - مگر ظاہر ہے کہ ابن ترمرت کے ذکر سے ضیاء کی تائید مراد نہیں -

---

۱- تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۲۴۶

حضرت علامہ متنبہ کرتے ہیں کہ جن احوال سے ترک دو چار ہیں انھیں احوال سے دیگر مسلمان اقوام کو بھی واسطہ پڑنے والا ہے حضرت علامہ نے ترکوں کی بیداری اور عالم خیال سے عالم حقیقت کی جانب انتقال کی بھرپور تائید کی ہے، یہ بات اپنی جگہ خوش آئند ہے کہ حقیقت سے گریباں گیر ہونے کا جذبہ پیدا ہو، مگر اس ساری تائید کے ہمراہ یہ انتباہ بھی ہے جو علامہ اقبال کے مزاج کی توازن پسندی اور اعتدال جوئی پر دلالت کرتا ہے۔

"بہرحال ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام پر عالم اسلام میں پھیل رہی ہے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ ہے، آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقے اور انتشار کی طرف ہوتا ہے [1]

حضرت علامہ اقبال نے اس ضمن میں لوتھر کی مثال دی ہے اور اس کی تحریک اصلاح کا حوالہ دے کر مزید احتیاط روا رکھنے کی تلقین کی ہے [2]

واضح ہے کہ لوتھر کی تحریک اصلاح آگے چل کر مخصوص نسلی اور قومی ریاستوں کے لایختم انتشار کا اختیارروپ حاصل کرگئی ہاں یہ بات اپنی جگہ تسلیم کہ حضرت علامہ کو اسلام کے دامان کی وسعت پر بھرپور بھروسہ ہے اور انھیں یقین ہے کہ اس کے اندر ہر بھلی بات کو اپنے نظام میں سمو لینے کی گنجائش موجود ہے ان کے نزدیک اسلامی قانون کی یہی روح میں دنیا کارفرما ہے۔ اور وہ بالتاکید فرماتے ہیں کہ یہ روح اور بھی نمایاں ہوکر ہمارے سامنے آئے گی۔ چنانچہ یہاں انھوں نے پروفیسر ہرگرون زے (Hurgronje)

۱- تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۲۵۱
۲- ایضاً ص ۲۵۲

کے ایک دلچسپ قول کا حوالہ دیا ہے ۔

''جب ہم اسلامی قانون کی نشو و نما کا مطالعہ بہ نگاہ تاریخ کرتے ہیں تو جہاں یہ دیکھتے ہیں کہ فقہائے اسلام ذرا ذرا سے اختلاف میں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے بلکہ انھیں ملحد قرار دیتے تھے وہاں یہی حضرات اپنے پیشروؤں کے اختلاف کو اس لیے سلجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ اتحاد اور یکجہتی پیدا ہوسکے ۔ [۱]

علامہ اقبال معاصر دور کے اہل نظر نقادوں کی تائید میں کہتے ہیں کہ جیسے جیسے مسلمانوں میں زندگی کو تقویت پہنچے گی اسلام کی عالمگیر روح فقہا کی قدامت پسندی کے باوجود اپنا کام کرتی رہے گی اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ اسلامی قانون جامد نہیں ۔ اس میں مزید نشو و نما کی گنجائش موجود ہے ۔ جو امر علامہ کی بحث کی جان ہے وہ قرآن کی حرکی روح کے تقاضوں پر ان کا بھرپور ایمان ہے ۔ تاہم وہ ساتھ ساتھ آگاہ کئے جاتے ہیں کہ :

''زندگی محض تغیر ہی نہیں اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے'' [۲]

''۔۔۔زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے اس لیے ہمیں چاہیئے کہ جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ ہم نے قائم کیا ہے اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف کو فراموش نہ کریں ۔ تعلیمات قرآنی کی یہی وہ جامعیت ہے جس کا لحاظ رکھتے ہوئے جدید عقلیت کو اپنے ادارات کا جائزہ لینا ہوگا۔۔۔دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی سے قطع نظر نہیں کر سکتی اس لیے کہ یہ ان کا ماضی ہی تھا

۱- تشکیل جدید ، ص ۲۵۴
۲- ایضاً ص ۲۵۷

جس سے ان کی موجودہ شخصیت متعین ہوئی ۔ [۱]

حضرت علامہ کو یقین ہے کہ ملت اسلامیہ کی لاجغرافیائی روح اسے ایک نہ ایک دن روحانی یکجہتی کی دولت سے مالا مال کرکے تمام اقوام اسلام کو ایک خود شناس امت بنا دے گی ۔ چنانچہ وہ اسلام کے اجتماعی و سیاسی وغیرہ اداروں کو یہ کہہ کر داد دیتے ہیں کہ ان اداروں نے بہرحال مختلف الجنس پردوں میں ایک اجتماعی ادارہ اور اجتماعی ضمیر پیدا کر دیا ۔ لہذا وہ تاکید کرتے ہیں کہ ان اداروں میں ہاتھ ڈالنے سے قبل معترضین کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے اجتماع انسانی کو جو شکل دینے کی کوشش کی ہے اس کا معنی اور منشاء فی الحقیقت کیا ہے پیش نظر کوئی ایک ملک نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کا مفاد ہونا چاہیے ۔

حضرت علامہ نے قرآن کو اسلامی قانون کا اولین ماخذ قرار دیا ہے ۔ اور یہی فقہاء کا ہمیشہ رویہ رہا ہے البتہ علامہ واضح کر دیتے ہیں کہ قرآن کوئی قانونی ضابطوں کی ایسی کتاب نہیں جس میں جملہ امور مع جدا جدا جزاء و سزا ضابطہ وار اور دفعہ وار درج ہوں ۔ قرآن کی روح یہ ہے کہ انسان کو کائنات اور خالق کائنات سے اپنے ربط کا اعلیٰ شعور حاصل ہو ۔ قرآن نے انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کیا ہے مسیحیت کی طرح معاشرے کو ریاست، اور مذہب یعنی دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا ۔ حضرت علامہ قائل ہیں کہ فقہا نے بڑی محنت کی ہے ۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کریم کے حوالے سے کہا ہے کہ ''رومنوں کے بعد عرب ہی وہ قوم ہیں جن کے پاس بڑی محنت سے تیار کیا ہوا ایک نظام قانون موجود ہے [۲]

حضرت علامہ کی وفات کے کوئی پندرہ برس بعد چھپنے والی اپنی ایک کتاب میں گب نے دوسری صدی ھجری کے مسلم متکلمین

۱- تشکیل جدید ، ص ۲۵۷ ، ۲۵۸

۲- تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ، ص ۲۵۹

اور فقہا کی نظری ، آئینی اور ضوابطی کاوشوں کو سراہا ہے ۔ یہاں گب کے الفاظ کا اندراج بے جا نہ ہو گا :

"The Muslim Jurists and Theologon s of the second century of the hegera have elaborated a structure of law that is, from the point of logical perfection, one of the most brilliant essays of human reasoning" 1

علامہ نے بالصراحت بیان کیا ہے کہ فقہائے اسلام نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا ، ظاہر ہے کہ نئے احوال اور ہر دم وسعت پزیر تقاضوں کے فکری اثرات کی موجودگی میں مذاہب فقہہ کی خاتمیت پر اصرار کیسے کیا جا سکتا ہے ۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ کائنات ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے ۔ یہ حقیقت بجائے خود اس امر کی مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے ، یہ نہیں کہ اسے اپنے لیے ایک روک تصور کرے ۔

حضرت علامہ نے اپنے چھٹے خطبے میں کہ الاجتہاد فی الاسلام سے متعلق ہے ترکوں کی جانب بار بار لوٹ کر دیکھا ہے ، چنانچہ ضیاء گوکلپ کی بات پھر چھڑ جاتی ہے ۔ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضرت علامہ نے جہاں ترکوں کی اجتہادی کوششوں کو داد دی ہے وہیں کوئی نہ کوئی انتبا ہی آواز بھی بلند کر دی ہے ۔ چنانچہ وہ ضیاء کے اس مبحث پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں کے حقوق وراثت میں منصفانہ تبدیلی کی ضرورت ہے ۔ حضرت علامہ نے ضیاء کے موقف کا مدلل رد پیش کیا ہے ۔ ویسے اسلام میں عورت کے حقوق سے متعلق "شریعت اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ" کے زیر عنوان حضرت علامہ کا ایک مستقل مقالہ موجود ہے ۔ جو رفیق افضل صاحب کی تالیف "گفتار اقبال" میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ اس لیے یہاں اس مبحث کے ضمن میں مزید

1. Muhammadans, An Historical Suvrey (2nd) Oxford, 1953, p. 90.

کچھ عرض نہیں کیا جائے گا۔

ایک بات بہر حال ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس دور میں افغانوں اور ترکوں کی خبریں بوجوہ اور وہ بھی ایک حد تک مل جاتی تھیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کو بہت کم معلوم تھا کہ مراکش یا الجزائیر ، انڈونیشیا یا الجریا میں کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تجدد اور اجتہاد کا زیادہ جوش افغانوں کے بالمقابل ترکوں میں تھا۔ وہاں ایک ہمہ جہتی ہلچل تھی جو پورے معاشرے کے تقریباً ہر شعبے کو متاثر کر رہی تھی۔ نیز وہ ترک ہی تھے جن کے ساتھ بے وفائی کر کے عربوں نے ان کے ملی جذبے کو (خواہ وہ جس بھی درجے کا تھا) ٹھیس پہنچائی تھی۔ یہ زخم بالکل تازہ تھا۔ قومیت کی جانب ترکوں کے رجحان کے پس منظر میں یہ حقیقت ایک ٹھوس عامل تھی۔ پھر یہ ترک ہی تھے جو ابھی ابھی ڈوب کر بار دیگر ابھرے تھے ، اس لیے واضح ہے کہ حضرت علامہ نے بیشتر انہی کے اجتہادی معاملات سے بحث کی ہے ، اور ظاہر ہے کہ وہ معاملات بھی عموماً شنیدہ تھے۔ عالم اسلام سارا ایک ایسے جسم کی طرح تھا جس کا انگ انگ جدا ہو مگر ہر انگ جسم سے جدا ہو کر بھی گرم ہو ، مرنے پر تیار نہ ہو بلکہ ہر انگ اپنی اندرونی قوت سے بڑھ کر پورا جسم بن جانے کے لیے کوشاں ہو۔

حدیث : اسلامی فقہا کے یہاں دوسرا آئینی ماخذ حدیث ہے۔ حضرت علامہ نے گولڈ تسیہر کا حوالہ دیا ہے جس کے خیال میں مجموعہ ہائے احادیث ، مجموعی طور پر ناقابل اعتبار ہیں [1] مگر ایک اور مفکر کی زبانی بتایا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں جو مجموعہ ہائے احادیث معتبر ٹھہرائے جاتے ہیں، ان کا زائد حصہ فی الواقع اسلام کے ظہور اور ابتدائی نشو و نما کی حقیقی تاریخ

---

۱. تشکیل جدید ، ص ۲۶۳

ہے - علامہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے فقہی احادیث سے کم کم کام لیا ہے - آنہوں نے اسے بھی ارتقائے فقہ کی ایک صورت قرار دیا ہے - آنہوں نے امام ابو حنیفہؒ کی تائید بھی کی ہے اس لیے کہ بہرحال وہ اہل سنت ہی کے ایک امام ہیں - مگر ساتھ ہی مزاجی توازن پسندی کے تقاضا کے زیر اثر ، زور دے کر یہ بھی تحریر کر دیا ہے -

"بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ سب سے بڑی خدمت جو محدثین نے شریعت اسلامیہ کی سرانجام دی ہے یہ ہے کہ انھوں نے مجرد غور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کے بجائے ہر مسئلے کی الگ تھلگ شکل اور انفرادی حیثیت پر زور دیا ، لہذا احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی ، تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہو گی جو قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کئے ہیں" - [1]

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علامہ کے نزدیک ارتقائے فقہ کے باب میں حدیث کا کیا رتبہ ہے ، بعض احباب یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ حضرت علامہ حدیث کے معاملے میں بس مولوی کے ڈر سے رعایت برتتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ حدیث کے ضمن میں بھی حضرت علامہ کی اعتدالی فطرت و خصلت بخوبی نمایاں ہے - نہ تائید میں غلو ، نہ تردید میں ، نہ سارا مجموعہ احادیث قابل قبول اور نہ سرے سے حدیث کے ایک مفید ماخذ فقہ ہونے سے انکار اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا ، حضرت علامہ تو ماضی کے ثمر اور ثمرے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے

---

۱. تشکیل جدید ، ص ۲۷۷

ہیں - بقول محمد تقی امینی :

"حدیث کی حجیت اور اس سے فقہہ کے استنباط میں کسی فقیہ نے کلام نہیں کیا ، البتہ اس کے قبول کرنے کے طریقوں میں اختلاف ہوا ہے اور ہر فقیہہ نے اپنے اپنے معیار کے مطابق اس کے ضابطے اور طریقے مقرر کئے ہیں" - ۱

رہا اجماع تو اس ضمن میں ڈاکٹر صبحی محمصانی کی تحدید و تعریف یہ ہے -

"کسی حکم شرعی پر کسی زمانے میں مسلمان مجتہدین کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے" - ۲

آگے چل کے ڈاکٹر محمصانی لکھتے ہیں :

"مگر امام حنبل اور داؤد ظاہری کے نزدیک اجماع خاص صحابہ کا اجماع ہے - کسی اور کا نہیں" - ۳

حنابلہ کے باب میں N.J Coulson بھی ڈاکٹر محمصانی کے موید ہیں - ۴

حضرات خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کی مجلس شوریٰ تھی جس کو آج اسمبلی سے کسی حد تک مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے -

اجماع کے بارے میں حضرت علامہ نے یہ اظہار کیا ہے کہ یہ مآخذ اسلام کے اجتہادی تصورات کے باب میں سب سے اہم ہے ، اس ضمن میں اہم اور زور دار نظری بحثیں بھی عمل میں آئیں مگر آگے چل کے یہ مباحثی مجالس شوریٰ کسی ادارے کا روپ نہ دھار سکیں ، حضرت علامہ نے اس کا سبب مطلق العنان حکومتوں کا ظہور پذیر ہونا قرار دیا ہے - ایسی مباحثی مجالس خود مختار حکام

۱- فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور ، ڈھاکہ مئی ۱۹۷۵ء ، ص ٦٦

۲- فلسفہ شریعت اسلام ترجمہ از مولوی محمود احمد رضوی ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ص ۱۲۲

۳- ایضاً ص ۱۲۴

۴- Islamic Survey, Edinburgh, 1964, P. 202

و سلاطین کے مفاد کے خلاف ہوتیں ۔[1] اسی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے آگے چل کے حضرت علامہ وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت میں مسرت کی ایک لے صاف محسوس ہو رہی ہے :

"بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشو و نما اور قانون ساز مجلس کا یہ تدریجی قیام ایک بڑا ترقی زا قدم ہے ، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سردست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں ۔ اپنا یہ حق مجلس تشریعی کو منتقل کر دیں گے ، یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے ممکن بھی ہے تو اس وقت اجماع کی یہی شکل -- مزید براں غیر علماء بھی جو ان امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں اس میں حصہ لے سکیں گے ، میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوابیدہ ہے از سر نو بیدار کر سکتے ہیں ، یونہی اس کے اندر ایک ارتقائی نقطہ نظر پیدا ہوگا" ۔[2]

مجلس تشریعی کے توسط سے رو پذیر ہونے والے اجماع کو حضرت علامہ کے یہاں خصوصی اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس طریقہ سے مختلف ملکوں کے اهل نظر و قانون کے باہم قریب آ جانے کی امید ہوگی لہذا انفرادی اور ملکی بلکہ فرقہ وارانہ اجتہاد کے بجائے اگر مجلس تشریعی میں کسی مسئلے کی چھان پھٹک ہو جائے تو اس میں وہ لوگ بھی جو علمائے فقہ تو نہیں مگر زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہونے کی بنا پر اپنے تجربات کی روشنی میں رائے دینے پر قادر ہوں گے شامل ہونگے یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا کوئی فیصلہ بھی قرآنی روح سے متصادم نہیں ہونا چاہئیے ، مجالس تشریعی اساساً قرآنی روح ہی کو بروئے کار لائیں گی مگر مختلف

۱- تشکیل جدید ، ص ۲۶۶ ، ۲۶۷

۲- تشکیل جدید ، ص ۲۶۸

زاویہ ہائے نظر اور گونا گوں تجارب کی عطا کردہ بصیرتوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا فرحت بخش تصور ہے ۔

اور ہمیں یہ بات بہر حال نظر انداز نہیں کرنی چاہئیے کہ حضرت علامہ جب یہ مباحث پیش کر رہے تھے اس وقت ترکی اور سعودی عرب کو چھوڑ کر باقی تقریباً سب مسلم ممالک یا باضابطہ غلام تھے یا زیر انتداب تھے ۔ حضرت علامہ کا اپنا وطن انگزیزوں کا غلام تھا اور انھوں نے اسی مقالے میں اظہار بھی کیا ہے کہ برصغیر میں نئی اجتہادی کوششیں کیونکر بروئے کار آئیں گی ، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ، مراد یہ ہے کہ حضرت علامہ کا جس وطن سے تعلق تھا وہ غلام تھا ، عالم اسلام کے ممالک کی کثرت کثیرہ غلام تھی ، اور حضرت علامہ کی روشن امیدی اور عزم کا عالم یہ ہے کہ وہ فقہ اسلامی میں اجتہاد کی ضرورت پر اس قدر زور دے رہے تھے ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علامہ کی نظریں عالم اسلام کے ضمن میں اس یقین سرشار سے سرمایہ دار تھیں کہ بس چاکری کے بندھن اور غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے ہی والی ہیں ۔ لہذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ آنے والے دور کے لیے تیاری کریں اور اپنی معاشرت کے جملہ امور کو اسلام کے دائمی اصولوں کے مطابق نئی روشنی ، نئی صورت اور نئی قوت دینے کے عزم سے ابتدائی کام کر رکھیں ، حضرت غالب نے خدا جانے حسرت و شکست کے لب و لہجہ میں شعر ذیل کہا تھا یا امید و عزم کے استحکام کی تصویر کھینچی تھی ، مگر میں اس شعر کو حضرت علامہ کے خوش امید بلکہ پر امید دل کا ترجمان مانتا ہوں اور قرار دیتا ہوں کہ حضرت علامہ جن حالات اور احوال میں کام کر رہے تھے اس ساری کیفیت کی غالب کا یہ شعر خوبصورت ترجمانی کرتا ہے ۔

مثال ہے میری کوشش کی یہ کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

ہاں اجماع کے باب میں حضرت علامہ نے اس امر پر بھی بحث کی ہے کہ آیا اجماع قرآن کا بھی ناسخ ہے؟ علامہ وضاحت کرتے ہیں کہ کسی اسلامی مجلس میں یہ سوال اٹھانا غیر ضروری ہے مگر ایک مغربی نقاد نے بغیر کوئی سند پیش کئے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ احناف اور معتزلہ کے نزدیک اجماع قرآن کا بھی ناسخ ہے ۔ حضرت علامہ نے بالصراحت اور دعوے کے لب و لہجہ میں لکھا ہے کہ اسلامی فقہ میں اس قسم کی غلط بیانی کی تائید میں کوئی ادنی سی مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی [۱] واضح ہے کہ اجماع خواہ کتنے ہی عقلا کا ہو شریعت پر حاوی نہیں ہو سکتا ۔ اجماع کے سلسلے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری رقمطراز ہیں :

"خدا نے شریعت کو جمعیت آرا سے قائم نہیں کیا [۲] "

اور پھر اسی ذیل میں اسی صفحے پر اضافہ کرتے ہیں

"اجماع جو اجتماع آرا کا نام ہے کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کو منسوخ نہیں کر سکتا ۔ پس اتباع اجماع اپنی ذات میں واجبات شرعی میں سے نہیں" ۔

رہا اجماع صحابہ اور اس کی حجیت تو علامہ کی تصریح یہ ہے کہ :

"ہم ایک امر واقعی اور امر قانونی میں فرق کریں ، مثلاً اس مسئلے میں کہ آخری دو سورتیں معوذتان قرآن پاک کا جزو ہیں یا نہیں اور جن کے متعلق صحابہ کا بالاتفاق یہ فیصلہ ہے کہ یہ سورتیں جزو قرآن ہیں ۔ ہمارے لیے ان کا اجماع حجت ہے کیونکہ یہ صرف صحابہ تھے جو اس امر واقعی کو

۱- تشکیل جدید ، ص ۲۶۹
۲- رسالہ اجتہاد و تقلید ، اہل حدیث اکادمی ، کشمیری بازار لاہور ، ص ۱۱

ٹھیک ٹھیک جانتے تھے ، بصورت دیگر یہ مسئلہ تعبیر و ترجمانی کا ہوگا لہذا ہم کرخی کی سند پر یہ کہنے کی جرات کر سکتے ہیں کہ اس صورت میں صحابہ کا اجماع ہمارے لیے حجت نہیں ، کرخی کہتا ہے کہ صحابہ کا طریق انھیں باتوں میں حجت ہے جن میں قیاس سے کام نہیں چلتا ، جن معاملات میں قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے ان میں ہم انھیں حجت نہیں ٹھہرائیں گے ۱ -

جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا حضرت علامہ نے دور معاصر کے تقاضوں کی روشنی میں اجماع کا حق ایک طرح سے ہر اسلامی ملک کی پارلیمنٹ کو دیا ہے ، لیکن وہ افراد اس خطرے سے بخوبی واقف تھے کہ عام مجالس قانون ساز کے رکن وہ بھی ہوں گے جو بالعموم فقہ کی نزاکتوں سے آگاہ نہ ہوں گے ، اس کا علاج ایران نے 1906ء میں یہ کیا کہ ایک مجلس علماء کی بنیاد رکھی تاکہ وہ پارلیمنٹ کی قانون سازی پر نظر رکھے ، حضرت علامہ کو علماء کی اس مجلس سے بھی کھٹکا محسوس ہوتا ہے اور اس طریق کار کو بھی پر خطر قرار دیتے ہیں - لہذا وہ کہتے ہیں کہ ایران کی مثال کو اگر سنی ممالک سامنے رکھیں تو بھی زیادہ مدت کے لیے نہیں - اس کا مطلب یہ ہوا کہ موقت بندوبست کے طور پر وہ کسی مجلس علماء کے خلاف نہیں تاہم ایک دائمی ادارے کے طور پر اس کا قیام لازم ولابد نہیں چاہتے - گمان یہ ہے کہ حضرت علامہ علماء کو پارلیمنٹ کے خلاف فیصلہ کن ووٹ کی حیثیت نہیں دینا چاہتے ، وہ پارلیمنٹ کی نگرانی یا رہنمائی بھی چاہتے ہیں مگر علماء کے ویٹو سے بھی متحذر ہیں - ممکن ہے وہ علماء کی اکثریت کو فقہ میں اجتہاد کا قائل نہ جانتے ہوں ، یہ بھی ممکن ہے وہ علماء کے نزاع باہم سے بھی گھبراتے ہوں ، بہرحال علامہ کے ضمن میں ان کی واضح احتیاط کا

۱- تشکیل جدید ، ص ۲۶۹ ، ۲۷۰

تقاضا یہی ہے - وہ کسی نہ کسی طرح کا تناسب و توافق چاہتے ہیں کوئی عدم توازن انھیں گوارا نہیں۔تاہم جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے - علامہ یہ تجویز ضرور پیش فرماتے ہیں کہ مجلس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک موثر جزو کے شامل کیا جائے اور علماء کو بھی تلقین کی ہے کہ وہ کھلے مباحثے کی مدد سے بھی اور تبادلہ آرا کی اجازت دے کر بھی حق راہنمائی ادا کریں - [1]

ظاہر ہے کہ حضرت علامہ کے نزدیک پارلیمنٹ یا مجلس قانون ساز کو ایک طرح سے مجلس شوریٰ کی حیثیت حاصل ہے - جس میں علماء کی ایک تعداد رکن ہو - اور اگر وقتی طور پر علماء کی کوئی اعلیٰ مجلس ایسی بھی ہو جو باہر سے پارلیمنٹ کی فقہی کارروائیوں پر نگاہ رکھے تو جب بھی کوئی حرج نہیں مگر واضح ہے کہ علامہ نے اس ضمن میں یہ تفصیلی بات نہیں کہی - انھوں نے ((Broad Based) وسیع القواعد اصول بتا دیئے ہیں - یہ امر کا مجلس قانون ساز کے رکن کس اہلیت کے ہوں ؟ علماء کے انتخاب کی صورت یا طریق کیا ہو ؟ اور جو علما پارلیمنٹ سے باہر پارلیمنٹ کے ناظر و نگران ہوں ان کا چناؤ کس طرح عمل میں آئے گا گویا یہ سب معاملات حقیقت واقعی کے ظہور پذیر ہونے کی ساعتوں کے امانت دار ہیں - عملی دور شروع ہو تو عملی ، تشکیلی اور نفاذی عقدے رفتہ رفتہ حل ہونے لگتے ہیں - محمد نقی امینی بھی اجماع کے سلسلے میں ایک مجلس مشاورت کے قیام کی ضرورت پر زور دیتے ہیں مثلاً لکھتے ہیں -

''اجماع کی اصل اور ممکن العمل صورت یہی ہے کہ قانونی معاملات میں اہل حل و عقد کی ایک مجلس مشاورت قائم ہو اور وہ حالات و مسائل میں غور و فکر کے بعد اس کا صحیح حل تجویز کرے ، جو ایک طرف کتاب و سنت کے خلاف نہ

۱- تشکیل جدید ، ص ۲۷۱

ہو اور دوسری طرف ضروریات زندگی سے ہم آہنگی پیدا کرنے والا اور دشواریوں پر قابو پانے والا ہو،، [۲]

محمد تقی امینی نے ''مجلس مشاورت،، کا مشورہ تو دیا مگر یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا مجلس مشاورت سے مراد پارلیمنٹ ہے یا مجلس قانون یا محض اہل حل و عقد کی ایک جمیعت جو مشورے پیش کرتی رہے ، اسی طرح محمد تقی امینی نے یہ بھی واضح نہیں کیا کہ اہل حل و عقد سے کیا مراد ہے ، وہ لوگ کن اوصاف و کمالات کے مالک ہوں گے اور علم دین سے ان کی آگاہی کا درجہ کیا ہوگا ۔ یہ جملہ مسائل تشنہ تشریح ہیں ۔ بہرحال جیسا کہ ہم عرض کر رہے تھے حضرت علامہ نے کچھ وسیع القواعد سے اصول بتائے ہیں جن میں کسر و انکسار کی گنجائش بالکل واضح ہے تاکہ عملی مشکلات کو ان اصولوں کی روح کے مطابق حل کیا جا سکے ۔

حضرت علامہ ۱۹۳۸ء میں انتقال فرما گئے ، ان کی وفات تک چند مسلم ممالک کو چھوڑ کر باقی سب مغربی استعمار کے پنجہ غلامی میں گرفتار تھے ، اور علامہ نے جو کچھ بھی لکھا عیاں ہے کہ وہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کی خاطر نہ تھا بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے تھا ، جنگ عظیم دوم کے بعد استعماری قوتیں ٹوٹ گئیں اور مسلم اوطان و اقوام نے یکے بعد دیگرے آزادی کا سانس لینا شروع کیا ، پاکستان بھی معرض وجود میں آ گیا (جس کے قیام کا تصور حضرت علامہ ہی نے دیا تھا جس کے وجود میں آ جانے کا انھیں یقین تھا اور جس کے حصول کی خاطر انھوں نے قائد اعظم محمد علی جناح کو امت کا خضر وقت قرار دیا اور یہ ذمہ داری سنبھالنے کے معاملے میں ان کو قائل کرنے کے لیے تادم آخر تلقین جاری رکھی اور پھر اسی راہ جہاد میں انھوں

۱۔ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ، ص ۲۷

نے اپنے آخری دو سال میں گونا گوں عوارض کے باوصف اپنے آپ کو قائد اعظم کا ایک سپاہی بنائے رکھا) ۔ بہرحال مختلف مسلم ممالک و اقوام کی آزادی کے بعد اجماع کے باب میں میدان عمل بہت وسیع ہوگیا ۔ اہل نظر مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اب مل بیٹھنے کے مواقع میسر آ سکتے ہیں چنانچہ ۱۹۴۹ء میں پاکستان میں مسلم ممالک کی پہلی اقتصادی کانفرنس منعقد ہوئی ، پھر یہ سلسلہ جاری رہا ، مسلم ممالک کے نمائندے کسی نہ کسی انداز میں اکھٹے ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ حتیٰ کہ جدہ میں عالم اسلام کا ایک مشترکہ سیکٹریئیٹ بھی وجود میں آ چکا ہے، اب گنجائش ہے کہ اجماع کو مشترکہ ''ندوۃ،، میسر آجائے جس میں پورے عالم اسلام کے چیدہ اہل نظر و فکر اور ارباب فقہ و اصول کا اجتماع ہو جہاں وہ مل بیٹھیں اور مسائل پر اجتہادی آرا کا نچوڑ امت کی خدمت میں پیش کریں تا کہ امت کی فقہی نظر یکساں ہو جائے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری امت کا رویہ و عمل ہم آہنگ ہو سکے گا ۔ پوری امت کا ہم دل و ہم فکر ہونا ممکن نظر آئے گا اور پھر جب ہم آئین ہو کر دستوری معاملات میں خود اعتمادی پیدا کر لیں گے اور سعی و کوشش سے اس میدان میں بھی خود کفیل ہو جائیں گے تو پھر ہم مختلف غیر مسلم ممالک سے لیے ہوئے دستوری قرضے بھی لوٹا دیں گے ۔ مسلم امت اس وقت کہیں فرانسیسی قواعد کی مقروض ہے کہیں برطانوی قانون اور عدالتی نظام کی ، کہیں سوئٹزر لینڈ کے ضوابط مستعار لیے ہوئے ہیں اور کہیں اطالوی ، ہسپانوی اور ولندیزی ، انشاء اللہ دیگر قرضوں کی طرح ہم یہ قرض بھی اتار دیں گے ۔

الاستاذ محمد ابو زہرہ کے کلمات ذیل میں یہی روح کار فرما ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی انہونی بات یا محال امر ہے ۔ بین الاقوامی ہمہ جہتی دباؤ مسلم اقوام کو مجبور کر رہے ہیں کہ

وہ یکجا ہوں اور وجود واحد بن کر قوت و کمال حاصل کریں ، اس ضمن میں فقہی ہم آہنگی نہایت ضروری بلکہ لابد ہے ۔ ہاں تو الاستاذ محمد ابو زہرہ کہتے ہیں :

"فاذا اردنا ان نعید للشریعة و فقهها روحها و حیویتها بالاجتهاد الواجب استمراره فی الامة شرعاً والذی هوالسبیل الوحید لمواجهة المشکلات الزمنیة الکثیرة بحلول شرعیة جریئة ۔ فالوسیلة الوحیدة الی ذلک هی ان نوسس اسلوباً جدیداً للاجتهاد هو اجتهاد الجماعة بدلا من الا جتهاد الفردی و طریقة ذلک ان یوسس مجمع للفقه الاسلامی علی طریقة المجامع العلمیة واللغویة (الا کادیمیات) و یضم هذا المجمع من کل بلد اسلامی اشهر فقهائه الراسخین ممن جمعوا من العلم الشرعی والا ستناره الزمنیة و صلاح السیرة والتقوی" [1]

"پس اگر ہمارا ارادہ یہ ہو کہ ہم اجتہاد مسلسل کی مدد سے جس کا تسلسل شرعاً واجب ہے شریعت اور اس کی فقہ کی روح اور ولولے کو از سر نو بیدار کریں اور ظاہر ہے کہ عصر رواں میں پیش آمدہ کثیر التعداد عقدوں کا جرأت مندانہ شرعی حل ہی اس کا واحد طریقہ ہے ۔ تو اس مقصد کے حصول کی راہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ہم اجتہاد میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالیں جس کا مطلب ہے کہ اجتہاد فردی کی جگہ اجتماعی اجتہاد عمل میں آئے ۔ اس کا اسلوب عمل یہ ہو کہ فقہ اسلامی کے لیے بھی ایک ایسی اکادمی بنائی جائے جیسے سائنسی اور لسانی اکادمیاں ہیں ، اس اکادمی میں ہر اسلامی ملک کے معروف ترین فقہائے راسخین شامل ہوں جن کی ذات میں شرعی علم ، عصری روشنی حسن سیرت ، اور تقوی جمع ہوں"

۱۔ الندوة العالمیة الاسلامیة ، مطبعہ جامعہ پنجاب (۱۳۷۹) ص ۱۰۹

اجتہاد کا در کسی اجماع نے بند نہیں کیا در کھلا ہے اور وہ در اس طرح کھلا ہے کہ ذرا اس میں سے جھانک کر دیکھیں تو ر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے،، ۔ کا سا منظر کھلا ہے ۔

قیاس

رہا قیاس کا مسئلہ تو حضرت علامہ کے نزدیک اس کا معنی ہے ۔ قانون سازی میں مماثلتوں کی بنا پر استدلال سے کام لینا ۔ قیاس کی تعریف ''نور الانوار،، کے الفاظ میں یہ ہے :

''ھو تقدیر الفرع بالاصل فی الحکم والعلۃ،، ۱

(فرع کو -- جسے مقیس کہتے ہیں نہ اصل بمعنی مقیس علیہ کے ساتھ حکم اور علت میں برابر کرنا) ۔

''اس ضمن میں 'مسلم الثبوت ،، کے الفاظ یہ ہیں :

''مساوات المسکوت بالمنصوص فی علۃ الحکم،، ۲

(جس امر کا شریعت میں حکم نہ آیا ہو ۔ اس کو منصوص کے ساتھ یعنی جس کا حکم آیا ہو ۔ حکم کی علت میں برابر کرنا)

مولانا ثناءاللہ امرتسری وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''واضح رہے کہ قیاس تین اصول پر متفرع ہو سکتا ہے ،،

(۱) کوئی ایسا حکم ہو جو قرآن مجید میں ہو اس پر کسی دوسرے غیر مذکورہ حکم کو قیاس کرنا ۲ کوئی ایسا حکم ہو جو حدیث میں ہے اس پر کسی دوسرے غیر مذکور حکم کو قیاس کرنا کوئی ایسا حکم ہو جو اجماع سے ثابت ہو اس پر قیاس کرنا ۳ اس کے علاوہ وہ علامہ وضاحت کرتے ہیں کہ قیاس اسی موقع پر عمل میں آئے گا ۔ جہاں کتاب و سنت اور اجماع راہنمائی نہ کرے ، علامہ کا مزاجی توازن یہاں بھی کار فرما ہے ، وہ محض عقلی موشگافیوں کے بھی قائل نہیں جو احناف کا شیوہ تھا کہ مجرد مسائل پر لمبی لمبی

۱- رسالہ اجتہاد و تقلید ، ص ۲۸
۲- ایضاً ، ص ۲۸
۳- ایضاً ، ص ۲۹

بحثیں ہوں حنفی فقہائے نے زندگی کی سن مانی اور تخلیقی آزادی سے تو آنکھیں بند کر لیں اور یہ سمجھ لیا کہ عقل محض کی بنیادوں پر وہ ایک ایسے نظام فقہ کی عمارت اٹھا سکتے ہیں جو منطقی اعتبار سے سرتا سر کامل و مکمل ہوگا۔ انھوں نے اس کے مقابل امام مالکؒ کے تجربوں اور ٹھوس معاملات سے تعرض کو پسند کیا ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے بطور ایک ماخذ قانون امام ابوحنیفہؒ کے اصول قیاس کی تنقید جس بالغ نظری سے کی ہے وہ اس آریائی رجحان کے خلاف موثر سامی روک تھی جس نے ہمیشہ مجرد کو محسوس پر ترجیح دی اور جو حادثہ سے اتنا لطف اندوز نہیں ہوتا جتنا خیالی سے۔ مگر ساتھ ہی حضرت علامہ نے اس امر کی بھی تصریح کر دی ہے کہ مالکی فقہاء بھی اس حقیقت پسندی کی توسیع میں کامیاب نہ ہوئے، وہ اس لیے کہ انھوں نے حجازی روایت میں اپنے آپ کو مقید کرلیا۔ مگر حضرت علامہ کے نزدیک اس بحث و مباحثہ کا اثر یہ ہوا کہ احناف نے استدلالی پہلو کے ساتھ ساتھ یقینی اور حقیقی کو بھی اپنے تفقہ کا جزو بنا لیا اس طر احناف کے دائرہ فکر میں بہت وسعت واقع ہوگئی، تاہم آگے چل کے احناف نے بھی فقہ کو سکہ بند کر دیا، دیگر مذاہب فقہ کی طرح [۱] اس کے باوصف بقول جناب علامہ:

"اگر مذہب حنفی کے اس بنیادی اصول قانون یعنی قیاس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کام میں لایا جائے تو جیسا کہ امام شافعیؒ کا ارشاد ہے وہ اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور اس لیے نصوص قرآنی کی حدود کے اندر ہمیں اس کے استعمال کی پوری آزادی ہونی چاہیے" [۲]

۱- تشکیل جدید، ص ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴

۲- ایضاً، ص ۲۷۴

اسی صفحے پر حضرت علامہ نے امام شوکانی کی زبانی کہا ہے :

''فقہا اس امر کے قائل تھے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران میں بھی قیاس سے کام لینے کی اجازت تھی ۔ لہذا یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے محض افسانہ ہے جس کا خیال کچھ تو اس لیے پیدا ہوا کہ اسلامی افکار فقہ ایک معین صورت اختیار کرتے چلے گئے اور کچھ اس ذہنی تساہل کے باعث کہ روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں لہذا اگر فقہائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس افسانے کی حمایت کی ہے تو کیا مضائقہ ہے'' [1]

ذرا آگے چل کر اسی صفحے پر حضرت علامہ نے علامہ سرخسی کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ اجتہاد کے باب میں یہ خیال درست نہیں کہ قدما کو اس ضمن میں وہ آسانیاں میسر تھیں جو متاخرین کو میسر ہیں علامہ سرخسی اس خیال کو معقول نہیں مانتے بلکہ بالعکس ان کی رائے یہ ہے کہ فقہائے متاخرین کو اجتہاد کے لیے زیادہ آسانیاں میسر ہیں ۔ یہی حضرت علامہ کا اعتقاد ہے ۔ اور اسی سلسلے میں تائیداً الاستاذ ابو زہرہ کا حوالہ دیا جا چکا ہے ۔

دین اسلام کی اعتدال افزا روح اور تناسب کار فطرت سے حضرت علامہ کے فکر و تخیل پر گہری چھاپ لگی ہے اور یہ حقیقت گویا ان کی مزاجی کیفیت بن گئی ہے ۔ انھوں نے فقہ اسلامی کے سرمایہ ماضی پر نظر ڈالی ، داد بھی دی ، تنقید بھی کی اور پھر ساتھ ہی کسر و انکسار کر کے توازن بھی بحال کرنے کی کوشش کرتے رہے ، وہ جمود کے دشمن تھے مگر وہ ترقی یافتہ اقوام کی کورانہ تقلید کو بھی آئین حرکت سے محترز رکھنا چاہتے تھے ، وہ اجتہاد کے زبردست حامی ہونے کے باوجود کم نظر مجتہدین کے

۱- تشکیل جدید ص ۲۷۴

مقابل ماضی کے اساطین کی تقلید کو ترجیح دیتے تھے انھوں نے جہاں ترکوں کو داد دی وہاں جب ان کے تجدد میں یورپ کی نقالی کا اندھا شوق در آیا تو فوراً انتباہ بھی کیا اور توبیخ بھی ، وہ حال سے بیزار نہ تھے مستقبل سے مایوس نہ تھے ، وہ حال کو سنوارنے کے لیے کوشاں رہے اور مستقبل کے بارے میں تو خاصے پر امید تھے ، انھیں بھرپور یقین میسر تھا کہ اسلام ہی حق ہے ، اسلام ہی دین فطرت ہے اور اسلام ہی کے روشن اصول انسانی معاشرے کے جملہ شعبوں کو باہم مربوط و متوازن رکھ سکتے ہیں ان کا یہ یقین کبھی بھی ڈول نہ سکا ۔ مارس گاڈ فرائے ڈی ممبنیز (Muarice Guadefroy Demomeynes) نے مسلم اقوام کے بے پناہ امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہی بات کہی ہے ۔

"These communities (Muslims) could play an economic and political part within the group and if they could achieve a development of the attitude towards religion, they might make a noble contribution to the spiritualization of humanity" 1

آدمی کو روحانی ہستی سے تبدیل کرنے کی یہی وہ تمنا ہے جس کا حصول حضرت علامہ کے نزدیک از سر نو تشکیل اسلام کے 'بنیادی اصولوں کے ذریعے ممکن ہے ۔

"تاآنکہ وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشو و نما جو اس کا مقصد و منتہا ہے تکمیل کو پہنچ سکے ۔ ۲

بقول گارڈ فرائے

"Islamic thought has slept soundly in Islam for centuries but practices have continued to be faithfully observed." 3

۱- Islamic Institutions, Allen and Unwin (London) P. 215

۲- تشکیل جدید ، ص ۲۷۷

Muslim Institutions, P. 10

اب مسلمانوں کو فکراً بیدار ہونا چاہیے ، غیر بیدار اعمال کسی بھی دین کے لیے حیات بخش اور باعث فخر و تقویت نہیں چہ جائیکہ اسلام کے لیے -

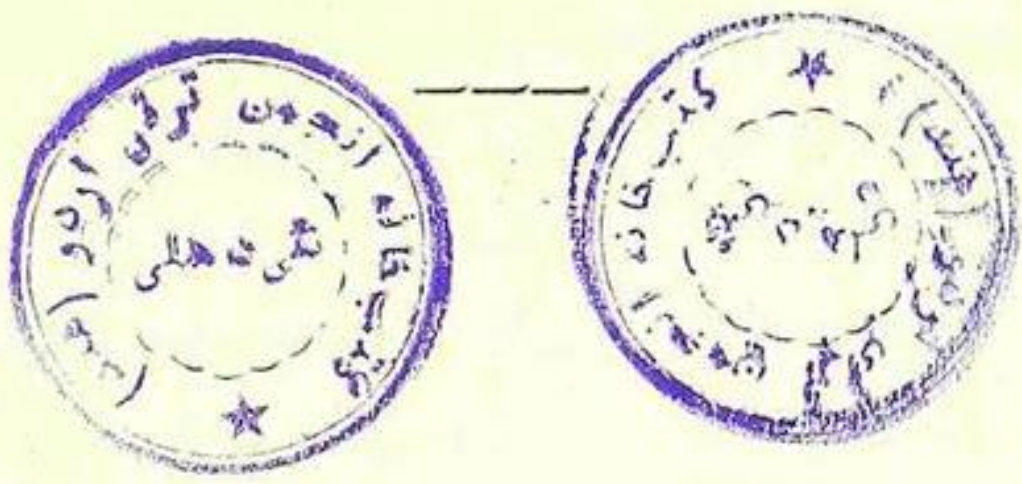

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن الشاہ مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے